

نغمہ فردوس

حصہ اول

مجموعہ کلام

خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔ اے
سابق گورنر و منسٹر ریاست جموں و کشمیر

مترتبہ

مولوی محمد عبداللہ صاحب کمال ایم۔ اے
پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سروشِ غیب

مناجات

ترے در پہ خالقِ ذوالِ منت جو مری جبینِ نیاز ہو !
 مجھے بے کسی پہ غرور ہو، مجھے بے نوائی پہ ناز ہو !
 مجھے سوزِ عشق کا ساز دے، مجھے دردِ زہرہ گداز دے
 مری میٹل شمع کے آبرو، یہی میرا سوز و گداز ہو !
 مری یاس کی شبِ تار میں، مرے غم کے گرد و غبار میں
 ترا لطف چارہ نواز ہو، ترا نور جلوہ طراز ہو !
 مرا روز جلوہ فروز ہو، ترے رخ کے نورِ جال سے
 مری شب کی محفلِ انس میں تری بوئے زلفِ دراز ہو !
 غمِ ماسوا سے نجات دے، مجھے اپنے غم کی برات دے
 درِ غیر مجھ پہ فراز ہو، فقط ایک در ترا باز ہو !
 کوئی ایسا طرفہ نظام ہو کہ جہاں کا صدق پہ کام ہو
 نہ ہوس کے ہاتھ زمام ہو، نہ یہ نفس کی تگ و تاز ہو !
 ہو شہود شاہدِ راز کا، یہ مٹے طلسمِ مجاز کا
 کبھی اے حقیقتِ مستتر ! ترے رخ سے پردہ جو باز ہو !
 مری آنکھ بقعہ نور ہو ترے آفتابِ جال سے
 مرے سامنے ترا آئینہ وہ جبینِ ماہِ حجاز ہو !

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سروشِ غیب

ہنajat

ترے در پہ خالقِ ذوالِ المنن جو مری جبینِ نیاز ہو !
 مجھے بے کسی پہ غرور ہو، مجھے بے نوائی پہ ناز ہو !
 مجھے سوزِ عشق کا ساز دے، مجھے دردِ زہرہ گداز دے
 مری میٹل شمع کے آبرو، یہی میرا سوز و گداز ہو !
 مری یاس کی شبِ تار میں، مرے غم کے گرد و غبار میں
 ترا لطف چارہ نواز ہو، ترا نور جلوہ طراز ہو !
 مرا روز جلوہ فروز ہو، ترے رخ کے نورِ جلال سے
 مری شب کی محفلِ انس میں تری بوءِ زلفِ دراز ہو !
 غمِ ماسوا سے نجات دے، مجھے اپنے غم کی برات دے
 درِ غیر مجھ پہ فراز ہو، فقط ایک در ترا باز ہو !
 کوئی ایسا طرفہ نظام ہو کہ جہاں کا صدق پہ کام ہو
 نہ ہوس کے ہاتھ زمام ہو، نہ یہ نفس کی تگ و تاز ہو !
 ہو شہود شاہدِ راز کا، یہ مٹے طلسمِ مجاز کا
 کبھی اے حقیقتِ مستتر ! ترے رخ سے پردہ جو باز ہو !
 مری آنکھ بقعہ نور ہو ترے آفتابِ جلال سے
 مرے سامنے ترا آئینہ وہ جبینِ ماہِ حجاز ہو !

یہ جو فرشِ اسفلِ خاک ہے، یہ نجاستوں کا مٹاک ہے
 مرا سجدہ پایہٴ عرش پر، مری لامکاں میں نماز ہو !
 دل و دیدہ میں وہ سائے تو، وہ شرارِ شوق جگائے تو
 مرے ارغنونِ حیات میں یہی پردہ ہو، یہی ساز ہو !
 ہو پیامِ دردِ صدا میری، ہو سرورِ عشقِ نوا میری
 جو فلک کے پردے کا ساز ہو، جو ملک کے سجدے کا راز ہو !
 مرا ”حَسْبِيَ اللَّهُ“ حصار ہو، مرا ”لَا تَحْزَنْ“ پہ قرار ہو
 : ہو مرا مقامِ بلند تر، جو کمنہٴ فتنہ دراز ہو !
 تجھے ناظر! اتنی ہو فکر کیوں؟ غم و اضطراب کا ذکر کیوں؟
 ترے فکرِ کار میں رات دن جو ترا غریب نواز ہو !

پیماںِ الست

ہم پرستارِ خدا ہیں، ہم خدا کے ساتھ ہیں
 ہر گھڑی، ہر لحظہ اور ہر دم خدا کے ساتھ ہیں
 سازِ فطرت ہے بہارا عشق سے رنگیں نوا
 نغمہ ہاءِ دل کے زیر و بمِ خدا کے ساتھ ہیں
 ایک پیماں سے سب کو کر دیا مستِ الست
 عہد و پیمانِ ازل محکمِ خدا کے ساتھ ہیں
 پرتوِ مہرِ ازل میں ہست و بود اپنی ہے گم
 ہم، مثالِ قطرۂ شبنم، خدا کے ساتھ ہیں
 گر شغالاتِ شکم پرورِ خدا سے دور ہیں
 دشتِ زارِ عشق کے ضیغمِ خدا کے ساتھ ہیں

دشتِ حرماں میں رہے نامحرمانِ کوہِ دوست
 اور حریمِ عشق کے محرمِ خدا کے ساتھ ہیں
 سرنگوںِ قعرِ مذلت میں رہے باطل پرست
 ”اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ“ کے پرچمِ خدا کے ساتھ ہیں
 شش جہت میں ساری و سائر ہے نور ”لَمْ يَزَلْ“
 صد ہزاراں عرصہٴ عالمِ خدا کے ساتھ ہیں
 چپکے چپکے کان میں یہ کہہ رہا ہے دل کہ ہم
 ”لِي مَعَ اللّٰهِ“ * ہر نفس، ہر دمِ خدا کے ساتھ ہیں
 ذرّہ ہو خورشیدِ تاباں سے بھلا کیونکر جدا
 ہم خدا کے ساتھ تھے اور ہم خدا کے ساتھ ہیں
 منزلِ ہستی میں ناظرِ کاروانِ عشق کے
 سب نشاط و عیش و رنج و غمِ خدا کے ساتھ ہیں

جوگی

نغمۂ حقیقت

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالمِ بقعہٴ نور ہوا
 سب چاند ستارے ماند ہوئے، خورشید کا نور ظہور ہوا

* حدیث شریف میں وارد ہے: ”لِي مَعَ اللّٰهِ حِيْنَ لَمْ يَسْعِنِي فِيْهِ مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ
 وَلَا نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ“۔ مجھے خدا کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ وہاں
 نہ مقرب فرشتے کی گنجائش ہے نہ نبی مرسل کی۔

مستانہ ہوا گلشن تھی، جانانہ ادائے گلبن تھی
 ہر وادی وادی، ایمن تھی، ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
 جب باد صبا بضراب بنی، ہر شاخ نہال رباب بنی
 شمشاد و چنار ستار ہوئے، ہر سرو و سمن طنبور ہوا
 سب طائر مل کر گانے لگے، مستانہ وہ تانیں آڑانے لگے
 اشجار بھی وجد میں آنے لگے، گزار بھی بزمِ سرور ہوا
 سبزمے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ نشاط سجائی تھی
 بن میں، گلشن میں، آنگن میں، فرشِ سنجاب و سمور ہوا
 تھا دل کش منظرِ باغِ جہاں اور چال صبا کی مستانہ
 اس حال میں ایک بہاڑی پر جا نکلا ناظرِ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے، پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
 تھے خیمے ڈیرے بادل کے، گہرے نے قنات لگائی تھی
 یاں برف کے تودے گلتے تھے، چاندی کے فوارے چلتے تھے
 چشمے سیلاب آگتے تھے، نالوں نے دھوم مچائی تھی
 اک مست قلندر جوگی نے پربت پر ڈیرا ڈالا تھا
 تھی راکھ جٹا میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمانی تھی
 تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
 تھی ایک لنگوٹی زیب کمر، جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
 سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
 بیٹھا تھا جوگی مستانہ، آنکھوں میں مستی چھائی تھی
 جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا
 تیسکھے چتوڑ سے جوگی نے تب ناظر سے یہ کلام کیا

کیوں بابا فاحق جوگی کو تم کس لیے آ کے ستاتے ہو؟
 ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی، تم جال میں ان کو پھنساتے ہو؟
 کوئی جھگڑا دال چپاتی کا، کوئی دعوا گھوڑے ہاتھی کا
 کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا، تم ہم کو سنانے آتے ہو؟
 ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے، اس نگری سے منہ موڑ چکے
 ہم جو زنجیریں توڑ چکے، تم لا کے وہی پہناتے ہو؟
 تم پوجا کرتے ہو دھن کی، ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
 ہم جوت لگاتے ہیں من کی، تم آس کو آ کے بجھاتے ہو؟
 سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے، من میں ساجن کا ڈیرا ہے
 یاں آنکھ لڑی ہے پیم سے، تم کس سے آنکھ ملاتے ہو؟
 یوں ڈانٹ ڈپٹ کر جوگی نے جب ہم سے یہ ارشاد کیا
 سر آس کے جھکا کر چرنوں پر جوگی کو ہم نے جواب دیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی، یوں آنکھ نہ ہم سے چرا جوگی !
 ہم آئے ہیں تیرے درشن کو، چتون پر میل نہ لا جوگی !
 آبادی سے منہ پھیرا کیوں؟ جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں؟
 ہر محفل میں، ہر منزل میں، ہر دل میں ہے نور خدا جوگی !
 کیا مسجد میں، کیا مندر میں، سب جلوہ ہے ”وجہ اللہ“ کا
 پریت میں، نگر میں، ساگر میں، ہر آترا ہے ہر جا جوگی !
 جی شہر میں خوب بہلتا ہے، واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
 واں پریم کا ساگر چلتا ہے، چل دل کی پیاس بجھا جوگی !
 واں دل کا غنچہ کھلتا ہے، گلیوں میں موہن ملتا ہے
 چل شہر میں سنکھ بجا جوگی، بازار میں دھونی رما جوگی !

پھر جوگی جی بیدار ہونے، اس چھیڑ نے اتنا کام کیا
پھر عشق کے اس متوالے نے یہ وحدت کا اک جام دیا

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا !

جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا !
ہے شہروں میں غل شور بہت اور کام کرو دھ کا زور بہت

بسترے ہیں نگر میں چور بہت، سادھوں کی ہے بن میں جا بابا !
ہے شہر میں شورشِ نفسانی، جنگل میں ہے جلوہ روحانی

ہے نگری ڈگری کثرت کی، بن وحدت کا دریا بابا !
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں، چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں

راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں، پر جا کی نہیں پروا بابا !
سر پر آکاش کا منڈل ہے، دھرتی پہ سہانی مخمل ہے

دن کو سورج کی محفل ہے، شب کو تاروں کی سبھا بابا !
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں، مستی کا رنگ جاتے ہیں

چشمے طنبور بجاتے ہیں، گاتی ہے ملار ہوا بابا !
جب پنچھی مل کر گاتے ہیں، پیتم کے مندیس سناتے ہیں

سب بن کے برچھ جھک جاتے ہیں، تھم جاتے ہیں دریا بابا !
ہے حرص و ہوا کا دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں

سل، پتھر، اینٹ، مکان تمہیں دیتے ہیں یہ راہ بھلا بابا !
ہر ماتما کی وہ چاہ نہیں اور روح کو دل میں راہ نہیں

ہر بات میں اپنے مطلب کے تم گھڑ لیتے ہو خدا بابا !
تن من کو دھن میں لگاتے ہو، ہر نام کو دل سے بھلاتے ہو

مائی میں لعل گنواتے ہو، تم بندہ حرص و ہوا بابا !

دھن دولت آتی جانی ہے، یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے، باقی ہے ذاتِ خدا بابا !

ترانہ وحدت

جب سے مستانے جوگی کا مشہور جہاں افسانہ ہوا
اُس روز سے بندہ ناظر بھی پھر بزم میں نغمہ سرا نہ ہوا
کبھی منصب و جاہ کی چاٹ رہی، کبھی پیٹ کی پوجا پاٹ رہی
لیکن یہ دل کا کنول نہ کھلا اور غنچہ خاطر وا نہ ہوا
کہیں لاگ رہی، کہیں پیت رہی، کبھی بار رہی، کبھی جیت رہی
اِس کلجگ کی یہی ریت رہی، کوئی بند سے غم کے رہا نہ ہوا
یوں تیس برس جب تیر ہوئے، ہم کارِ جہاں سے سیر ہوئے
تھا عہدِ شبابِ سراپِ نظر، وہ چشمہ آبِ بقا نہ ہوا
پھر شہر سے جی آکتانے لگا، پھر شوقِ مہار آٹھانے لگا
پھر جوگی جی کے درشن کو ناظر اک روز روانہ ہوا :

کچھ روز میں ناظر جا پہنچا پھر ہوش رہا نظاروں میں
پنجاب کے گرد غباروں سے کشمیر کے باغ بہاروں میں
پھر بن ہاسی پیراگی کا ہر سمت سراغ لگانے لگا
بنہال کے بھیانک غاروں میں، پنجال کی کالی دھاروں میں
اپنا تو زمانہ بیت گیا سرکاروں میں، درباروں میں
پر جوگی میرا شیر رہا پریت کی سونی غاروں میں

وہ دن کو ٹہلتا پھرتا تھا ان قدرت کے گزاروں میں
 اور رات کو محو تماشا تھا انبر کے چمکتے تاروں میں
 برفاب کا تھا اک تال یہاں یا چاندی کا تھا تھال یہاں
 الہاس جڑا تھا زمرّد میں، یہ تال نہ تھا کہساروں میں
 تالاب کے ایک کنارے پر یہ بن کا راجہ بیٹھا تھا
 تھی فوج کھڑی دیوداروں کی، ہر سمت بلند حصاروں میں
 یاں سبزہ و گل کا نظارہ تھا اور منظر پیارا پیارا تھا
 پھولوں کا تخت اُتارا تھا، پریوں نے ان کہساروں میں
 یاں بادِ سحر جب آتی تھی، بھیروں کا ٹھاتھ جاتی تھی
 تالاب رباب بجاتا تھا، لہروں کے تڑپتے تاروں میں
 کیا مستِ النست نوائیں تھیں ان قدرت کے بزمِ ماروں میں
 ملہار کا روپ تھا چشموں میں، سارنگ کا رنگ فواروں میں
 جب جوگی جوشِ وحدت میں ہرنام کی ضرب لگاتا تھا
 اک گونج سی چگر کھاتی تھی، کہساروں کی دیواروں میں
 اس عشق و ہوا کی مستی سے جب جوگی کچھ ہشیار ہوا
 اس خاک نشین کی خدمت میں یوں ناظرِ عرض گزار ہوا

کل رشکِ چمن تھی خاکِ وطن، ہے آج وہ دشتِ بلا جوگی !
 وہ رشتہ آفتِ ٹوٹ گیا، کوئی قسم لگا نہ رہا جوگی !
 برباد بہت سے گھرانے ہوئے، آباد ہیں ہندی خانے ہوئے
 شہروں میں ہے شورِ بیا جوگی، گاؤں میں ہے آہ و بکا جوگی !
 وہ جوشِ جنوں کے زور ہوئے، انسان بھی ڈنگر ڈھور ہوئے
 بچوں کا ہے قتل روا جوگی ! بوڑھوں کا ہے خون ہیا جوگی !

یہ مسجد میں اور مندر میں، ہر روز تنازع کیسا ہے؟
 ہمیشہ ہے جو ہندو کا، مسلم کا وہی ہے خدا جوگی!
 کاشی کا وہ چاہنے والا ہے، یہ مگرے کا متوالا ہے
 چھاتی سے تو بھارت ماتا کی دونوں نے ہے دودھ پیا جوگی!
 ہے دیس میں ایسی بھوٹ پڑی، اک قہر کی بجلی ٹوٹ پڑی
 روٹھے متروں کو منا جوگی! بچھڑے پیروں کو ملا جوگی!
 کوئی گرتا ہے، کوئی چلتا ہے، گرتوں کو کوئی کچلتا ہے
 سب کو اک چال چلا جوگی! اور ایک ڈگر پر لا جوگی!
 وہ میکہ ہی باقی نہ رہا، وہ خم نہ رہا، ساقی نہ رہا
 پھر عشق کا جام پلا جوگی! یہ لاگ کی آگ بجھا جوگی!
 پریت کے نہ سوکھے روکھوں کو یہ پریم کے گیت سنا جوگی!
 یہ مست ترانہ وحدت کا چل دیس کی دھن میں گا جوگی!
 بھگتوں کے قدم جب آتے ہیں، کلجنگ کے کلش مٹاتے ہیں
 تھم جاتا ہے سیلِ بلا جوگی! رک جاتا ہے تیرِ قضا جوگی!
 ناظر نے جو یہ افسانہ غم رودادِ وطن کا یاد کیا
 جوگی نے ٹھنڈی سانس بھری اور ناظر سے ارشاد کیا

بابا! ہم جوگی بن باسی، جنگل کے رہنے والے ہیں
 اس بن میں ڈیرے ڈالے ہیں، جب تک یہ بن بریالے ہیں
 اس کام کرو دھ کے دھارے سے ہم ناؤ بچا کر چلتے ہیں
 جاتے یاں منہ میں مگر مچھ کے دریا کے نہانے والے ہیں
 ہے دیس میں شور پکار بہت اور جھوٹ کا ہے پرچار بہت
 واں راہ دکھانے والے بھی برے راہ چلانے والے ہیں

کچھ لالچ لوہے کے بندے ہیں، کچھ مکر فریب کے پھندے ہیں
 مورکھ کو پھنسانے والے ہیں، یہ سب مکڑی کے جالے ہیں
 جو دیس میں آگ لگاتے ہیں، پھر آس پر تیل گراتے ہیں
 یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں اور نرگ کے سب یہ نوالے ہیں
 بھارت کے پیارے پوتوں کا جو خون بہانے والے ہیں
 کل چھاؤں میں جس کی بیٹھینگے وہی پیڑ گرانے والے ہیں
 جو خون خرابا کرتے ہیں، آپس میں کٹ کٹ مارتے ہیں
 یہ بیر بہادر بھارت کو غیروں سے چھڑانے والے ہیں؟
 جو دھرم کی جڑ کو کھودینگے، بھارت کی ناؤ ڈبو دینگے
 یہ دیس کو ڈسنے والے ہیں جو سانپ بغل میں پالے ہیں
 جو جیو کی رکھشا کرتے ہیں اور خوف خدا سے ڈرتے ہیں
 بھگوان کو بہانے والے ہیں، ایشور کو رجھانے والے ہیں
 دنیا کا ہے مرجن ہار وہی، معبود وہی، مختار وہی
 یہ کعبہ، کلیسا، بت خانہ، سب ڈول آسی نے ڈالے ہیں
 وہ سب کا پالنے والا ہے، یہ کنبہ آسی کا سارا ہے
 یہ پیلے ہیں یا کالے ہیں، سب پیار سے آس نے پالے ہیں
 کوئی ہندی ہو کہ حجازی ہو، کوئی ترکی ہو یا تازی ہو
 جب نیر پیا اک ماتا کا، سب ایک گھرانے والے ہیں
 سب ایک ہی گت پر ناچینگے، سب ایک ہی راگ الاپینگے
 کل شیم گھنٹیا بھر بن میں مرلی کو بجانے والے ہیں
 آکاش کے نیلے گنبد سے یہ گونج سنائی دیتی ہے
 انہوں کے مٹانے والوں کو کل غیر مٹانے والے ہیں

یہ پریم سندیسہ جوگی کا پہنچا دو آن مہاپرشوں کو
 سودے میں جو بھارت ماتا کے تن من کے لگانے والے ہیں
 پر ماتما کے وہ پیارے ہیں اور دیس کے چاند ستارے ہیں
 اندھیر نگر میں وحدت کی جو جوت جگانے والے ہیں
 ناظر! یہیں تم بھی آ بیٹھو اور بن میں دھونی رما بیٹھو
 شہروں میں گرو پھر چیلوں کو کوئی ناچ نچانے والے ہیں

افکارِ ملی

بارانِ نجد

بتقریب سالانہ اجلاس، اولڈ ہوائز ایسوسی ایشن،
 مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اے بادِ صبحگاہی! دل کی کلی کھلا دے
 ویرانہ میرے دل کا رشکِ چمن بنا دے
 آس بزمِ جانفزا کا نظارہ پھر دکھا دے
 گلزارِ آرزو میں پھر تازہ گل کھلا دے
 یہ کارزارِ ہستی ہے ریخ و غم کی ہستی
 پھر یادِ بزمِ جم میں اک جامِ جم ہلا دے
 اب شامِ زندگی کی ظلمت ہے چھانے والی
 وہ صبحِ دلکش کا نظارہ پھر دکھا دے
 ہستی میں پا بہ گل ہے عمرِ رواں کا دریا
 پھر آونچی وادیوں کے منظرِ اسے دکھا دے

وہ عہدِ شادمانی، وہ عطرِ زندگانی
 اے دورِ آسانی! واپس کہیں سے لا دے
 اے باغبان! ہو تجھ کو تختِ چمن مبارک
 مجھ کو وہ ہمنا دے اور میرا گھونسلا دے
 کن حسرتوں سے ناظرِ آس انجمن سے نکلے
 میلا سا لگ رہا تھا جب ہم چمن سے نکلے

احوالِ بزمِ گلشن، اے نامہ بر! سناتا
 وہ داستان ہے دلکش، رنگیں ہے وہ فسانا
 اس بزمِ دلکشا میں، آفت کی آس فضا میں
 تاروں کی روشنی میں، یاروں کا مل کے گانا
 کانوں میں رچ رہی ہے کوئل کی کوک اب تک
 ناظر کا ہے وظیفہ آس دھن میں گنگنا
 کالج کی سرزمین تھی یا نقشِ دلنشین تھی
 دل سے خیال آس کا ممکن نہیں بھلانا
 دریا میں مل کے جیسے ہوں ندیاں ہم آغوش
 بیگانہ کل جو آیا وہ آج تھا یگانا
 بھر طواف جانا پیرِ مغاں کے در پر
 اور آس کی اک نگہ سے سرمست ہو کے آنا
 آس چشمِ مست میں تھی یہ طرفہ اک کرامت
 پھرتی وہ جس طرف کو پھرتا ادھر زمانا
 اے وقت رفتہ! آجا، پھر وہ سماں دکھا جا
 ایسا بھی کیا تھا جانا پھر لوٹ کر نہ آنا

اے ناخدا! بھنور سے کشتی مری بچا کر
 یارِ انب آشنا سے بہرِ خدا ملانا
 درِ فصلِ گل کہ گلشنِ نقش و نگار بندد
 ناظرِ خیالِ خود را درِ بزمِ یار بندد

درمِ گلستان، بوستان

بتقریب جلسہ کانووکیشن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،
 بصدارتِ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال، نور اللہ مرقدہا

صبا! احوالِ بلبلِ بزمِ گلشن میں بیاں کر دے
 نوا سنجانِ بستان کو مرا ہمدستان کر دے
 خدارا، سارباں! مجھ کو فضاءِ غجد میں لے چل
 مجھے یارِ انب صحرائی کا ہمدم، ہمعیناں کر دے
 جوانی کا وہ درسِ شوق پھر لب پر رواں کر دے
 میرے دل کے دبستان کو گلستان، بوستان کر دے
 اگر اس باغ میں ہو آبیاریِ نونہالوں کی
 تو یہ خاکِ چمن پیدا ہزاروں باغباں کر دے
 یہ دارالعلم محور ہے نظامِ قوم و ملت کا
 بیانگِ کوس یہ رازِ نہاں سب پر عیاں کر دے
 علی گڑھ میں، الہی! وہ چراغِ علم روشن کر
 ضیا جس کی منور کشور ہندوستان کر دے
 بہت سے زیرِ گردوں زلزلے ہوں گے حوادث کے
 تو اس قصرِ مشید کو حصارِ جاوداں کر دے

ہوں دارالعلم کی محفل میں وہ رخشندہ سیارے
 کہ جن کی جلوہ پاشی اس زمین کو آسماں کر دے
 علی گڑھ جسم ملت میں مثال قلب مضطر ہے
 رگوں میں قوم کی اس دل سے موجِ خون رواں کر دے
 اگر دعواءِ الفت ہے تو خاکِ راہِ ملت ہو
 متاعِ زندگی قربانِ گردِ کارواں کر دے
 بکھر جائے جو صحرا میں تو ایک ناچیز ہستی ہے
 ملے قطروں سے جب قطرہ تو ایک دریا رواں کر دے
 پیاد خوش لقا و خوش عطا نقابِ پھیکم پور
 وظیفہ یا مزمل کا مرا وردِ زباں کر دے
 جو سرسید کی کھیتی کا جہاں میں پاسباں ہوگا
 وہ محبوبِ زمان ہوگا، وہ سلطانِ جہاں ہوگا

اگر ہر راہزن اس کارواں کا رہنا ہوگا
 تو اپنی کوششوں کا، ہمدمو! انجام کیا ہوگا؟
 کہیں علمی مجالس میں نیا سیلِ بلا ہوگا
 کہیں دینی مباحث میں کوئی محشر پیا ہوگا
 یہ دارالعلم آخر قوم کا مشکل کشا نکلا
 یہی بانگِ جرس ہوگا، یہی شورِ درا ہوگا
 یہاں ایک انجمن ہوگی وہ قومی باکمالوں کی
 کہ ہر ایک فردِ کامل جس کا نجمِ رہنا ہوگا
 جو صدرِ انجمن ہوگا ہماری بزمِ ملت کا
 وہ علمی مملکت کا قوم میں فرمانِ روا ہوگا

یہاں کثرت پرستوں پر چڑھ گا رنگ وحدت کا
 بتوں کو بھی اسی کعبہ میں دیدارِ خدا ہوگا
 علی گڑھ ایک بھٹی ہے کہ جو اس میں سے نکلے گا
 پرکھتے جاؤ گے جتنا وہ اتنا ہی کھرا ہوگا
 پھر، اے خاکِ حرم! کوئی خلیل اللہ پیدا کر
 کہ جس کا خوابِ یغما قوم کا حاجت روا ہوگا
 وراثتِ سیدِ مرحوم کی جامِ گدائی ہے
 جو اس گھر کا گدا ہوگا دلوں کا بادشاہ ہوگا
 برس جا مزرعِ ملت پہ، اے ابرِ کرم! کھل کر
 کہ ان چھینٹوں سے حاصل خشک لب کھیتی کا کیا ہوگا؟
 مریضانِ محبت سے یہ چھوٹے آستان کیوں کر؟
 یہی دارالامان ہوگا، یہی دارالشفاء ہوگا
 نسیمِ جانفزا آنے لگی سمتِ علی گڑھ سے
 نیا پھر گلشنِ سید میں کوئی گل کھلا ہوگا
 بہ جولانِ گاہِ ہستی تا بہ کئے ہر سو رواں باشی
 غنیمتِ داں اگر ناظرِ دمے با ہمدماں باشی

نعت

تضمین بر اشعارِ نعتیہ مولانا جامیؒ

بتقریب سالانہ اجلاس، انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور

صبا! اے پیکِ مشتاقان! خدارا!

سلام از ما رساں خیرالوراؒ را

پس از صلوات و تسلیم و تحیات
 بزاری بوسه ده آب خاک پا را
 پس آنگه داستان شوق سرکن
 که اے کوثر لب! مصحف عذارا!
 دم عیسٰی ز گیسوئت نسیم
 جمالِ یوسف از روئت نظارا
 ز موئت عنبریں گیسوء "والیل"
 ز رویت چشم روشن "والضحیٰ" را
 "قدت را پایہ" گردوں خرامی
 لبث را مایہ "یُحیی العظامی"
 ز عشقت جان و دل را خانه روشن
 ز شوقت دیدہ را گوہر بہ دامن
 ز انجم آسمان شد محفل افروز
 چو نورت بر زمین شد پرتو افکن
 شمیم موء تو در کوه و صحرا
 بہار روء تو در دشت و گلشن
 بہ کشتِ آمتان زینسان گزشتی
 کہ بر خاکِ بیابان ابر بہمن
 سوارِ ناقہ از صحرا رسیدی
 بشکرِ مقدمت در کو و برزن
 "جہانے دیدہ کردہ فرش راہ اند
 چو فرش اقبالِ پابوس تو خوابند"

ہوئی عالم میں تیری ذاتِ والا
 دلیلِ رحمتِ باری تعالیٰ
 کیا انسان کا ہمسر تو نے انسان
 برابر کر دیا سب پست و بالا
 بہنور میں آمتوں کا جب تھا بیڑا
 اسے گرداب سے تو نے نکالا
 نکل کر چاند نے غارِ حرا سے
 کیا اطرافِ عالم میں آجلا
 تری آمت کو، اے دریاءِ رحمت!
 پڑا موجِ حوادث سے ہے ہالا
 ”بدھ دستی ز پا آفتادگان را
 بکن دلداری دلدادگان را“

جہاں جلوے نئے دکھلا رہا ہے
 وہ فرشِ باستان اٹھوا رہا ہے
 جہاں ابرِ کرم تھا کل گہر ریز
 وہاں اولیٰ فلک برس رہا ہے
 نشانِ کاروان ملتا نہیں ہے
 حدیٰ خوان دشت میں چلا رہا ہے
 تھی جس کی چاندنی دشت و جبل پر
 وہ چاندِ اسلام کا گہنا رہا ہے
 تری آمت میں، اے مہرِ رسالت!
 غبارِ یاس ہر سو چھا رہا ہے

”بروں آور سر از سردِ سمانی
کہ روء تست صبحِ زندگانی“

ہوئی برہم وہ سب محفلِ پرانی
رہی اقبالِ رقتہ کی کہانی
بنی عباس پر ہے دجلہ نالار
سرشکِ خوب بنا دریا کا پانی
مٹا نام و نشانِ قصرِ حمرا
جو مغرب میں تھی مشرق کی نشانی
ہوئی وہ حشمتِ مغلیٰ فسانہ
کہانی ہے وہ فرّ ترکمانی
گئی وہ آب و تابِ بزمِ اکبر
مٹے **نقش و نگار** شہجہانی
”حریفانِ بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند“

چمن میں اب نہ پتا ہے نہ ڈالی
مٹے یکساں ادانی و اعالی
نہ علم و فضل ہے، نے جاہ و حشمت
ہوئے ہیں مسجد و میخانہ خالی
سلف کل جن کے صدرِ انجمن تھے
خلف کی جا ہے اب صفِ نعالی
خدا جانے ابھی لائے گی کیا رنگ
یہ دار و گیرِ ایام و لیالی

ہے تری ہر سانس بستانِ محبت کی شمع
 عندلیبِ زار تو ہے اور گلِ گلزار تو
 گر بھنور میں سیلِ غم کے کشتی، دل ڈگمگائے
 اک نگاہِ لطف سے کرتی ہے بیڑا پار تو
 ہے نوا جانفزا تیری اگر فردوسِ گوش
 ہے رخ و سیا سے اپنے جنتِ دیدار تو
 بزمِ عشرتِ غمکدہ ہو تو نہ ہو گر شمعِ بزم
 کنجِ غم ہو عیشِ سامانِ گر بنے غمخوار تو
 اہلِ جنت کا نہ لگتا روضہ، رضواں میں دل
 حورِ بن کر گر نہ ہوئی زینتِ گلزار تو
 جذبہِ ہاءِ دل کا انسان کے رہی محورِ مدام
 جاں بھی تو، جاناں بھی تو، دلبر بھی تو، دلدار تو
 شہد سے، شیر و شکر سے ہے مگر تیرا خمیر
 اس قدر شیریں ادا ہے اور شیریں کار تو
 دلربا پیکر میں تیرے رنگ اپنا بھر دیا
 ہے وہ نقاشِ ازل کا بہترین شہکار تو
 گود میں تیری پلے ہیں انبیا و اولیا
 ظلمتِ آفاق میں ہے مطلعِ انوار تو

ہے نظر میں تیری صحنِ خانہ گلزارِ بہشت
 گھر سے لپٹی ہے مثالِ سایہ، دیوار تو
 سرد مہری سے مثالِ سبزہ گر مرجھا گئی
 ایک چھینٹے سے محبت کے ہوئی دیدار تو

ایک جھونکے سے ہوا کے گو برس پڑتا ہے تو
جلد کھل جاتا بھی ہے، اے ابر گوہر بار تو
نصفِ بہتر مرد کا عورت کو کہتے ہیں مگر
ہے قباءِ زندگی کا اس کی ہود و تار تو
*وقتِ رخصت اپنی بربادی کا تجھ کو غم نہ تھا
حال پر فرزند و شوہر کے رہی خونبار تو
خانہ ویرانی اجل کر دے تو آکر بعدِ مرگ
جہانکٹی بھرتی ہے اس گھر کے در و دیوار تو
تو پتی کی پیت میں پہنچی مہابن میں کبھی
شعلہ ہاءِ نار کو سمجھی کبھی گلزار تو
ہے کسی مندر میں تو مہر و وفا کی مورتی
اور کسی معبد میں عفت کا بنی اوتار تو
ہاتھ میں تیرے رہی اولادِ آدم کی اٹھان
دین و ایمان، ملک و ملت کی بنی معار تو
تا ثریا فی المثل دیوار ٹیڑھی جائے گی
خشتِ بنیادی نہ رکھے اس کی گر ہموار تو
تو نے پیغامِ رسالت کو کیا اول قبول
سب سے پہلی مؤمنہ ہے اولینِ دین دار تو
گر چمنِ پیراءِ باغِ زندگی تو نہ ہو
سچ تو یہ ہے گلشنِ ہستی میں رنگ و بو نہ ہو

* اس اور اس سے اگلے شعر کا تخیل ذاتی مشاہدہ و احساس پر مبنی ہے۔

اپنے پیگانے کی تیرے دل میں غمخواری رہے
 باغِ عشرت میں ترے دم سے ہواداری رہے
 تجھ سے دنیاۓ محبت کا رہے ہنگامہ گرم
 باپ کی، بیٹے کی اور شوہر کی تو پیاری رہے
 مل کے باہم ہم کریں تعمیرِ قصرِ زندگی
 میری گل کاری رہے اور تیری گلکاری رہے
 ہو تواضع اور تمکین کا وہ باہم امتزاج
 پھول سے ہلکی رہے، پرہت سے تو بھاری رہے
 تیرے دم سے گلشنِ عالم میں، اے جنسِ جمیل!
 گل کی نکھت اور صبا کی نرم رفتاری رہے
 تیرے دل کا آئینہ گردِ کدورت سے ہو صاف
 گو غبارِ آلودہ رنگِ چرخِ زنگاری رہے
 تیری جوءِ شیر سے پیدا ہوں ایسے کوہکن
 شوقِ جانبازی کا جن سے سلسلہ جاری رہے
 نیند کے ماتوں کو اس خوابِ گراں سے تو جگا
 تیری بیداری سے اک عالم میں بیداری رہے
 سینہ رشکِ طور ہو، دل میں خدا کا نور ہو
 گو ہواءِ دہرِ ایمان سوز اور ناری رہے
 ابنِ آدم کی نظر میں ہو فزوں تیرا وقار
 پاسباں در پر ترے خود تیری خودداری رہے
 ہو گیا ہے کارزارِ زندگی دشوار تر
 اب نئے ہنگامہ زاروں کی بھی تیاری رہے

دل میں حُبُّ اللہ ہو، عشقِ رسولِ اللہ ہو
 دیں کی بھی دنیا کے خاکستر میں چنگاری رہے
 قوتِ ایمان سے ہے روح و روانِ زندگی
 ورنہ ہے گم کردہ رہ یہ کاروانِ زندگی

خیر مقدم

ہز بانئِ نس نقواب صاحب بہادر بہاول پور
 بتقریب سالانہ اجلاس، انجمن حمایت اسلام، لاہور

شہا! یہ قوم کا گلزار تھا بے برگ و بار اب تک
 چمن کے تحت کو تھا شاہِ گل کا انتظار اب تک
 مبارک یہ ترا نور و ظہور، اے صبحِ صادق! ہو
 کہ اپنا مطلعِ آمید تھا تاریک و تار اب تک
 بہاول پور میں پہلی تجلی نورِ وحدت کی
 طلوعِ نیرِ اسلام کی ہے یادگار اب تک
 سلف کا تھا ترے دربار وہ فردوسِ نظارہ
 ہیں جس کے صفحہٴ تاریخ پر نقش و نگار اب تک
 بنی عباس کا جاری تھا فرمانِ ہفت کشور میں
 اسی تاج و لیوا کے خوشہ چیں ہیں تاجدار اب تک
 تھا ایوانِ خلافت خوارزمِ یغما علم و حکمت کا
 کہ شرق و غرب آس احساں کا ہے مینت گزار اب تک

ہیں خاکِ ہند میں کچھ نقشِ پا آن شہسواروں کے
 ادب سے چومتے ہیں جن کو دشت و کوہسار اب تک
 کوئی تھا گنج بخشؔ ان میں، کوئی گنجِ شکرؔ ان میں
 خزانے معرفت کے ہیں بہت زیرِ مزار اب تک
 ہوا ہندوستانِ جنتِ نشان جن کی فضاؤں سے
 نہ آئی جا کے آن باغوں میں پھر فصلِ بہار اب تک
 خلفِ خانہ بدوش و خانماں برباد پھرتے ہیں
 سلف کے نام سے آباد ہیں شہر و دیار اب تک
 وہ ننگِ شہر بازاروں میں عبرت کا تماشا ہیں
 انہیں شہروں میں تھے اسلاف جن کے شہریار اب تک
 بہت مسلم کو پیسا آسیاءِ چرخِ گرداں نے
 بہت دیکھے ہیں اُس نے انقلابِ روزگار اب تک
 نسیمِ گلشنِ "لَا تَقْنَطُوا" لیکن ہے جاں پرور
 مسلمانِ لطفِ ربانی کا ہے آمیدوار اب تک
 بسا شبِ ہاءِ تارِ آبستنی نورِ سحر باشد
 ز خاشاکِ چمن پیدا چمنِ زارے دگر باشد :

شہا! ہو جلوہ فرما انجمن کی بزم میں آ کر
 فروغِ رخ سے نورانی مسلمانوں کی دنیا کر
 در و دیوار پر ہر سو ہے اک عالمِ تماشائی
 مسلمانوں کے اس جوشِ ارادت کا تماشا کر
 عجب جاں بخش منظر ہے خریدارانِ یوسف کا
 عزیزِ مصرِ زیبائی! ابھی کچھ نرخِ بالا کر

آفق پر قوم کے، اے صبحِ صادق! نور گستر ہو
 شعاعِ مہر سے غاروں کی ظلمت میں آجالا کر
 بہاول پور کے صحرا کو گلشن کر دیا تو نے
 وہ سیرابی کا سامان کِشتِ قومی میں مہیا کر
 ہزاروں کھیتیاں پیاسی ہیں آبِ زندگی کی
 تو اس جنگل میں منگل کر، تو اس چشمے کو دریا کر
 تو اس گلشن پہ مثلِ نخلِ طوبی سایہ گستر ہو
 تماشا "تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ" کا، اے سروِ رعنا! کر
 اُمنڈ کر آ رہا مغرب سے ہے الحاد کا طوفان
 تو اس سیلاب کو توحید کے پشتوں سے پسپا کر
 ہے شاہا! معشرِ اسلام اب اک قالبِ بے جاں
 اسی عزمِ جہاں بہا کا پھر مسلم میں احیا کر
 کیا جو نامکمل کام اک خیلِ گدایاں نے
 تو، اے شاہِ بلند اختر! سرانجام آں کو تنہا کر
 بہت درِ یتیم اس انجمن کے ہیں خزانے میں
 یہ مالا موتیوں کی زینتِ تاجِ معلیٰ کر
 شہا! اسلامیہ کالج کو یونیورسٹی کر دے
 عباءِ چائسلر اک روز زیبِ دوش و بالا کر
 تیرے اسلاف نے بغداد دجلے پر بسایا تھا
 تو اب دریاءِ راوی پر نیا بغداد پیدا کر
 بہ شکرِ مقدمتِ ہر ہر زبان صد مرحبا بادا!
 دریں رہ نقشِ پائتِ کارواں را رہنا بادا!

تصویرِ عبرت

بتقریب جلسہ، سرسید میموریل فنڈ، ریاست مالیر کوٹلہ

یہ نظم یہاں تک تو اصلیت پر مبنی ہے کہ ایک ساقی نے مجھے چاندنی چوک میں ایسا حقہ پلایا اور معلوم ہوا کہ وہ ایک سابق شاہی خاندان کا وارث تھا۔ باقی مکالمہ زبان حال کی تقریر ہے۔

سیرِ دہلی کو ایک دن ناظر چاندنی چوک سے جو جانے لگا
ایک ساقی "سالخورد و ضعیف" آ کے حقہ مجھے پلانے لگا
اُس کے حقے پہ سرسوں پھولی تھی سبزہ و گل کا لطف آنے لگا
نام پوچھا، کہا "مبارز خان" نام سن کر میں مسکرانے لگا
میرے ہنسنے پہ رو دیا ساقی اور یوں دردِ دل سنانے لگا
"نسلِ تغلق سے ہے یہ ننگِ سلف آج یوں ٹھوکریں جو کھانے لگا
بزمِ آبا جو ہو گئی برہم نام ساقی کا مجھ کو بھانے لگا
سن کے یہ داستانِ زہرہ گداز منہ کو میرا کلیجہ آنے لگا
کہا میں نے کہ ایسے جینے سے نامِ اسلاف کیوں مٹانے لگا؟
کہا رو کر کہ "سچ کہا لیکن کون تقدیر کو مٹانے لگا؟
میں تو جینے سے اپنے تھا بیزار پر مقدر مرا جلانے لگا
مجھ کو عبرت کی کھینچ کر تصویر
شہر و بازار میں پھرانے لگا"

یادِ رفتگان

مرثیہ سرسید

اس مرثیہ کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ سرسید اس مسعود کے اصرار پر اس کی نظر ثانی کی گئی۔

عرش کے نوری زمیں کے فرش پر آنے کو ہیں
 اور اک خاکی کو میںِ خلد دکھلانے کو ہیں :
 باغِ جنت کو سدھارا سیدِ عالی مقام
 راہ میں اُس کی ملائک نور برسانے کو ہیں
 وائے حسرت! چل دیا دنیا سے وہ محبوبِ قوم
 اور جو باقی ہیں اُس کے ہجر میں جانے کو ہیں
 ساقی! تیرے بادہ خواروں کے لیے
 خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو ہیں
 گلشنِ ملت میں غنچوں نے ابھی کھولی تھی آنکھ
 ایک جھونکے سے خزاں کے اب وہ مرجھانے کو ہیں
 چھپ گیا وہ روءِ رخشاں مہرِ عالمِ تاب کا
 اب شبِ یلدا کی ہر سو ظلمتیں چھانے کو ہیں
 اے شبِ بے تاج! وہ ماتم کی تیرے دھوم ہے
 تاجداروں کے علمِ اس غم سے جھک جانے کو ہیں
 دشت میں دوں لگ رہی ہے قیس کے ماتم میں آج
 آہوائِ نجد کی آنکھوں میں اشک آنے کو ہیں

سہارا بس تری اک ذات کا ہے

ایسا خیر البشر! "نعم الموالیٰ"

"تو ابرِ رحمتی آن بہ کہ گاہے

کئی ہر حال لب خشکان لگا ہے"

درس عشق

بتقریب سالانہ اجلاس، انجمن حمایت اسلام، لاہور

ہر زباں پر نالہ و فریاد ہے

دلبروں سے شکوہ بیداد ہے

جس کو دیکھو ہے جنوں کا پامے بند

اور قیدِ عقل سے آزاد ہے

سر میں شیخ و شاب کے ہے شورِ عشق

کچھ مزاجوں کی یہی آفتاد ہے

مطربِ ایام نے بدلا ہے ٹھاٹھ

یاں مغنی کی وہی فریاد ہے

شکلیں اقلیدس کی یاد آتی نہیں

گرچہ درسِ عشق ازبر یاد ہے

ہوں اگر دو چار عاشقِ غم نہیں

یاں تو گھر گھر وامق و فرہاد ہے

پڑ گیا ہے قوم کی گھٹی میں عشق

جس کو دیکھو قیسِ مادر زاد ہے

گر نہیں آتا تو اک کسبِ معاش

اور جس فن میں کہو استاد ہے

درسگاہیں دیں کی ویراں ہو گئیں

خانہ شعر و غزل آباد ہے

شورِ تحسین سے پھٹے جاتے ہیں کان

مرحبا! احسنت! کیا ارشاد ہے!

بادِ پیمائی میں گزری زندگی

کیا ہوا پر قلعہ کی بنیاد ہے؟

کیوں نکما کر رہے ہو قوم کو؟

ہمدمو! یہ داد سب بیداد ہے

کوہِ جانناں میں انہیں جاتے نہ دو

اے عزیزو! گر عزیزِ اولاد ہے

”بچ کے چلنا، اے غزالِ دشتِ شوق!

گھات میں دبکا ہوا صیاد ہے“

—

خواتین سے خطاب

بتقریب سالانہ اجلاس، انجمن حمایتِ اسلام، اپریل ۱۹۳۳ء

مرحبا، پیاری بہن! ملت کی ہے غمخوار تو

قوم کے گلزار پر ہے ابرِ گوہر بار تو

گلشنِ ایجاد میں ہے خندہ گل کی طرح

اپنی فطرت سے مسرت خیز و نکمت بار تو

مرثیہ

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

یہ مرثیہ بھی ملازمت کی بادیہ بیانی کے زمانہ میں لکھا گیا۔ مجھے جب مولانا کے انتقال کی خبر پہنچی تو اس کے ساتھ ہی علی گڑھ سے ایک مشاعرہ کا نوٹس مع مصرع طرح موصول ہوا۔ برادران علیگ کا تقاضا تھا کہ نظم تاریخ مشاعرہ سے پہلے روانہ کی جائے۔ عذیم فرصتی کی وجہ سے میں نے ایک ہی نظم سے دو کام لینے کا ارادہ کر لیا اور مصرع طرح کی زمین میں مرثیہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس بنیادی غلطی نے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا۔ یہ ردیف و قافیہ غزل کے لیے موزوں تھے مگر مرثیہ میں ان کی پابندی نے تخیل کے پاؤں میں ”ہو کر“ کی زنجیر ڈال دی اور اس بلند مرتبہ مجدد شعر، مصلح قوم اور بادی ملت کے مرثیہ کا پورا پورا حق ادا نہ ہو سکا۔ تاہم یہ ”صداء صحرا“ میرے ملکی الصفات اور محبوب استاد کی یادگار کا کام دے گی اور مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی۔

دلِ غم دیدہ چلا بادیہ پیا ہو کر
باغ و بستان نظر آیا مجھے صحرا ہو کر
آسماں تاک میں رہتا ہے مرے حاصل کی
برق و خرمین کا رہا روز تماشا ہو کر
اپنے گلشن میں رہی نالہ بلبلی کی صدا
خندہ گل کا کوئی روز نظارا ہو کر
آہ! حالی سے ہوا گلشنِ ملت خالی
مل گیا خاکِ چمن میں گلِ رعنا ہو کر

چھوڑ کر ناؤ کو گردابِ بلا میں لرزاں
 چل دیا کشتیِ اسلام کا کھیوا ہو کر
 ماتمِ قوم میں روتا وہ رہا شام و سحر
 اس کے نالے تھے کہ بہنے لگے دریا ہو کر
 طبعِ عالی تھی بہت عالمِ سفلی سے بلند
 عرشِ پرواز رہا فرشِ پہ پیدا ہو کر
 حبِ اسلام سے طینت تھی مخمرِ اس کی
 درد کا داغ رہا دل میں سویدا ہو کر
 دلِ پردرد سے اٹھی جو جگر دوز صدا
 گونجتی قوم میں تھی رعد کا کڑکا ہو کر
 اُس نے وہ میکدہ محفلِ خوباں چھوڑا
 بزمِ سید میں حریفِ مے و مینا ہو کر
 فکرِ عالی سے تھا اقلیمِ سخن کا والی
 تاجِ عزت کا رہا گوہرِ یکتا ہو کر
 چشمہٴ فیض سے اُس کے ہوئیں نہریں جاری
 دشت و امصار میں پھیلے گی جو دریا ہو کر
 کاش رہتا کوئی دن بندہٴ ناظرِ حاضر
 محفلِ خواجہ میں سرمستِ نظارا ہو کر
 بزمِ ملت میں رہا انجمنِ آرا ہو کر
 مطلعِ ملک کا رخشندہ ستارا ہو کر
 زندگی اس کی کتابی تھی شائلِ ملکی
 عیب سے پاک رہا خاک کا پتلا ہو کر

تھا بیاں آپ کا اک چشمہ شیریں کی مثال
 آپ حیوان سے جو نکلا ہو مصفا ہو کر
 لغو و ہذیاں سے مبرا تھا کلامِ حالی
 دورِ اسفل کی رہا سطح سے اعلیٰ ہو کر
 نہ تکلف، نہ تصنع، نہ تعلیٰ، نہ غلو
 ہر بناوٹ سے بری تھا رخِ زیبا ہو کر
 اس کی نکلا جو زباں سے وہ دلوں میں آترا
 رازِ فطرت کا حقیقت کا تقاضا ہو کر
 شرِ عشق جو تھا سینہ سوزاں میں نہاں
 عالمِ افروز ہوا جلوۂ سینا ہو کر
 تھا مجاز اس کا حقیقت کی ضیا سے روشن
 بزمِ دنیا میں رہا مشعلِ عقبیٰ ہو کر
 تھی نوا خواجہٗ حالی کی سرودِ افلاک
 حالِ دوراں جو وہ کہتا، وہی رہتا ہو کر
 غمِ ویرانی ملت سے وہ گھلتا ہی رہا
 گلِ ہوا، آہ! چراغِ رہِ صحرا ہو کر
 آہ! روتا تھا جو کل ایک جہاں کے غم میں
 اس کو روتا ہے جہاں والہ و شیدا ہو کر
 غیر فانی ہیں ابد تک وہ نفوسِ قدسی
 روح قوموں میں جو پھونکیں دمِ عیسیٰ ہو کر
 جنتِ الخلد میں، یا رب! ہو مقامِ حالی
 باغِ رضواں میں رہے وہ چمنِ آرا ہو کر

قطبہ تاریخ وفات

علیہا حضرت ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ
سابق فرمانرواء بہوپال، نوراللہ مرقدہا

دریغاً وہ بانو عالی مقام ہوئی کنج مرقد میں خلوت نشین
وہ مسہر درخشانِ علم و عمل وہ ماہِ جہاں تاب دنیا و دین
بھٹکتا جو قرون رہے آسمان پشکتی رہے سر جو برسوں زمیں
آفاق پر نہ دیکھینگے بھر قوم کے وہ چرخ ہدایت کا ماہِ مبین
تھا ہر بات میں لطفِ قند و نبات ملی شیر میں تھی مگر انگلیں
امیری میں ذوقِ فقیری رہا وہ ”الْفَقْرُ فخری“ تھا خاطر نشین
منور ز انوارِ ایمان رخس مزین ز آثارِ سجدہ جبین
تواضع سے خم تھا سر تاجور ”نہد شاخِ پر میوہ سر ہر زمیں“
وہ اقلیمِ ملت کی تھی تاجدار وہ تھی کشورِ دین کی مسند نشین
سب اسلامیوں کے تھے دارالعلوم اسی خرمنِ جود کے خوشہ چیں
تھی تا زیستِ اسلام کی خادمہ وہ مخدومہ کافۃ المسلمین
تھی اس قالبِ خاک میں جانِ پاک صدف میں رہے جیسے درِ تمیں
وہ دل میں تھا خوفِ خدا مرتسم کہ خاتم میں ہو جیسے نقشِ نگین
یہ ہنگامِ رخصت تھی لب پر دعا کہ، اے مالکِ آسمان و زمیں !
تری حفظ میں ہو حمید اللہ خان مرا وارثِ ملک و تاج و نگین
ز سالِ وفاتش چو با چشمِ تر نشانِ جستِ ناظر ز روحِ الامین
در آسمان باز کرد و بگفت

کہ سلطانِ جہاں شد بہ عرشِ بریں

ہدیۂ تاج

روضہ تاج محل کی سیر سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی گئی۔

علی گڑھ کالج کی فضا میں یہ میری پہلی نظم تھی۔

کچھ بتا احوالِ دل، اے منزلِ خامش زباں !
کیوں نظر آتا ہے حسرت خیز تیرا آستان ؟
ہے یہ کس عرشِ آشیان، فردوسِ منزل کا مکان ؟
سو رہی ہے باغِ جنت میں کوئی حورِ جناں ؟
یا بخوابِ ناز سیرِ دلبرانِ خوابیدہ است ؟
منزلِ عشق است و شورِ کارواںِ خوابیدہ است ؟

تیرے گلشن کی فضا میں کیفِ روحانی ہے کیا ؟
عندلیبوں کی نوا میں وجدِ پنہانی ہے کیا ؟
آیتِ ”طوبی لکم“ ہر غلِ بستانی ہے کیا ؟
روضہ ممتاز، عکسِ باغِ رضوانی ہے کیا ؟
تو بہ عالمِ جلوہ ای از ”جنت المآوا“ متی ؟
یا بہ دنیا مژدہ ای از عالمِ بالاسی ؟

چادرِ مہتاب سے آجلا ہے پیراہنِ ترا
سبزہ تر سے زمردِ فام ہے دامنِ ترا
یہ ترا حسبِ دل آرا اور یہ سادہ پنِ ترا
کیا جنوں انگیز ہے نکھرا ہوا جوہنِ ترا

ایک سینے میں تھی سید کے تڑپ اسلام کی
 ہم مسلمان سب براء نام کہلانے کو ہیں
 کاروانِ قوم کا ہنگامہ تیرے دم سے تھا
 یہ نہ تھا معلوم حضرت کوچ فرمانے کو ہیں
 بوسہ گاہِ قوم ہوگا تیرا سنگِ آستان
 نقش پا پر تیرے لاکھوں قافلے آنے کو ہیں
 ”ہر زمان این رہگذر را کاروانِ دیگر است
 کشتگانِ عشق را ہر لحظہ جانِ دیگر است“

ہائے! وہ خورشیدِ انور، چہرہ تاباں ترا
 ہائے! وہ ماہِ منور، عارضِ رخشاں ترا
 وہ نگاہیں جانفزا اور وہ ادائیں دلربا
 وہ جبینِ دلکشا، وہ دل فروز عنوان ترا
 ہائے! اس ریشِ مبارک پر وہ بارشِ نور کی
 شامِ پیری میں بیاضِ صبحِ نور افشاں ترا
 ہائے! وہ جانبِ بصیرت، تیرا نورانی دماغ
 ہائے! وہ کانِ محبت، سینہٗ سوزاں ترا
 وہ تری شانِ جلالی، وہ ترا رعبِ جال
 پڑ گئی جس پر نظر تھا بندہٗ فرمان ترا
 مہدی و مشتاقِ ہمدم، شبلی و حالی ندیم
 اور زینِ العابدین، وہ خاصہٗ خاصاں ترا
 بام و در کالج کے ہیں ماتم میں تیرے سرنگوں
 مرثیہ خواں بن گیا ہر کاخ و ہر ایوان ترا

دل سے خشت و سنگ کے کالج میں اٹھتی ہے صدا

کیا ہوا، میرِ عمارت! خانہ ویراں ترا؟
تا جہاں میں ہے ترے نانا کی اُمت کو بقا

قوم میں ماتم رہے گا، سید احمد خاں! ترا
بندہ پرور! وقتِ رخصت یاد فرمایا نہ کیوں؟

ناظرِ مہجور تھا وابستہ داماں ترا
اے چمنِ پیرا ملت! تیرے شوقِ دید میں

تھا نواسنجِ فغاں یہ بلبلی بستان ترا
سر بہ صحرا اب رہیں گے، آہ! دیوانے ترے

شمعِ تربت کا کریں گے طوف پروانے ترے

ہائے! بزمِ قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون؟

ماہ کی مانند ہالے میں نظر آئے گا کون؟
اے مسیحا قوم کے! تجھ بنِ عظامِ خستہ کو

”قمِ باذنی“ کہہ کے اب جنبش میں پھر لائے گا کون؟
دیکھ کر چتون تری اٹھتے تھے دل میں ولولے

اُس نگاہِ گرم سے اب دل کو گرمائے گا کون؟
تھا ترا روءِ منور ایک نجمِ رہنما

اب وہ نورانی فضا ظلمت میں دکھلائے گا کون؟
اس شعاعِ روحِ پرور سے پھر، اے ماہِ منیر!

دل کے دریا میں وہ رقصِ موج دکھلائے گا کون؟
خانہِ جنگی ہر طرف ہے معشرِ اسلام میں

ہائے! تجھ بنِ ان کے یہ آجھاؤں ملجھائے گا کون؟

دار و گیر دہر، مثلِ عرصہ شطرنج ہے
 یارِ شاطر بن کے اس کی چال بتلائے گا کون؟
 جوگیوں کا روپ بھر کر قوم کی اسٹیج پر
 ”ما نمی خواہیم ننگ و نام را“ گائے گا کون؟
 روٹھ کر جاتا ہے سید، آؤ لیں اس کو منا
 ورنہ اتنی مشکلیں آسان فرمائے گا کون؟
 دفن کرنا صحن میں کالج کے سر سید کی لاش
 اس خلیل اللہ سے کعبہ کو چھڑوائے گا کون؟
 یوں تو لاکھوں آئیں گے اس نجد میں اور جائیں گے
 سید احمد سا جنوں سامان مگر آئے گا کون؟
 اے حریفان! ”آن قدح بشکست و آن ساقی نماند“
 جرء، ای جز اشکِ خون در جامِ ما باقی نماند

سید مرحوم امت کا بھلا کرتا رہا
 فکرِ مات روز و شب، صبح و مسا کرتا رہا
 جو فلاحِ قوم کی آئی سمجھ میں آس کی بات
 برملا کہتا رہا اور برملا کرتا رہا
 تھی اسے پروا تحسین اور نہ کچھ نفرت کا ڈر
 اس کو جو کرنا تھا بے رو و ریا کرتا رہا
 ناسزا سنتا رہا اور مرحبا کہتا رہا
 کفر کے فتووں میں کام اسلام کا کرتا رہا
 گر ہوئے ناکامیوں سے حوصلے یاروں کے پست
 ہمتِ عالی کا اپنی اقتضا کرتا رہا

قوم میں پھر تازہ ذوقِ بت پرستی دیکھ کر
 اک نیا کعبہ علی گڑھ میں بنا کرتا رہا
 آکے کالج کے یہ قصر و کاخ و ایوان دیکھے
 کام جو شاہوں کا تھا سو یہ گدا کرتا رہا
 اس نے کی اسلام اور اوہامِ باطل میں تمیز
 زنگ سے آئینہ دیں کی جلا کرتا رہا
 کفر کے حملوں میں تھا اسلام کی دائم سپر
 عالمِ امت یہ کارِ انبیا کرتا رہا
 شاہدِ اردو کی زلفوں کے نکالے پیچ و خم
 حسن کے غمزوں کو فطرت آشنا کرتا رہا
 بہ چلی تھی امتِ مرحوم سیلِ غدر میں
 موت کے طوفان میں کارِ ناخدا کرتا رہا
 زندگی سید کی تھی قلبِ تپاں کی زندگی
 تھی جہاں کی زندگی جانِ جہاں کی زندگی

چھپ گیا وہ مہرِ تاباں بزمِ دوراں چھوڑ کر
 مطلعِ امید کا تاریک عنوان چھوڑ کر
 فصلِ گلشن میں چلا بزمِ گلستان چھوڑ کر
 شاخسارِ آرزو کو گلی بہ داماں چھوڑ کر
 نالہٗ دل دوزِ صحنِ بوستان میں سر کیا
 بلبلاں زار نے درسِ گلستان چھوڑ کر
 آ لیا سیلِ فنا نے کارواںِ سالار کو
 قافلے کو دشتِ حرماں میں پریشان چھوڑ کر

پیر کنعاں کی جدائی سے جگر ہے پاش پاش
 گو چلا ہے مصر میں وہ ماہِ کنعاں چھوڑ کر
 سو گیا کنجِ لحد میں شاہِ بے تاج و سریر
 باغ و راغ و بارگاہ و قصر و ایوان چھوڑ کر
 فیض سے تیرے رہی وابستہ حاصل کی آمید
 تشنہ لب کھیتی نہ جا، اے ابر نیساں! چھوڑ کر
 یہ تو بتلا دے کہ ہے کس کا سہارا قوم کو
 کعبہ، دم، قبلہ، جاں! تیرا داماں چھوڑ کر؟
 کون ہوگا مریدِ میدان اب مصافِ دہر کا؟
 ہاتھ میں کس کے چلا ہے گو و چوگاں چھوڑ کر؟
 بندہ پرور! یہ جنونِ عشق کے شایاں نہ تھا
 سیرِ گلزارِ ارم، خارِ مغیلاں چھوڑ کر!
 گلے گلے قوم کی حالت پہ بھی کرنا نظر
 سیرِ جنت چھوڑ کر، گلگشتِ رضواں چھوڑ کر
 اس چمن میں روح مندلائی رہے گی آپ کی
 جائے گی بلبل کہاں بزمِ گلستاں چھوڑ کر؟
 دار فانی کی ہے ناظرِ گرچہ فانی زندگی
 کشتگانِ عشق کی ہے جاودانی زندگی

آسماں گو ہے وہی، چاند ستارے بھی وہی
 روپ بھرتا ہے نیا چرخِ کہن پانی میں
 ہیں شکارے میں سیہ چشم بتاب کشمیر
 یا اترتے ہیں غزالانِ ختن پانی میں
 عکس مہتاب کا تالاب میں ہے جلوہ فگن
 یا نہاتا ہے کوئی سیم بدن پانی میں
 ہیں شکاروں کی قطاروں میں مغنی سرخوش
 با دف و چنگ و مزامیر مگن پانی میں
 ذکر و تسبیح میں ہیں ایک طرف حضرت شیخ
 برہمن گاتے ہیں اک سمت بھجن پانی میں
 ڈل سے کہتے ہیں بہت چاہنے والے اس کے
 تیرے عشاق کا ہو گور و کفن پانی میں
 بزمِ ناظر کی بھی مستانہ نوائیں سن کر
 رقص کرتے تھے کبھی اہل سخن پانی میں
 مُغْتَمِ صحبتِ احباب ہے ڈل میں ناظر
 غرق کر کشتی افکار و یخن پانی میں
 آبِ ڈل کی ہے وہ گلریز و نواخیز فضا
 بلبلیں بن گئے ہیں زاغ و زغن پانی میں

لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنا لیں، ناظر!
 موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

شعلہ بر جاب می زند این جلوہ رخسار تو
دل بہ غارت می برد این رونق بازار تو

یہ سار دیکھیں اگر آ کر شبِ مہتاب میں
اشکِ شبنم، برگِ گل کے دیدہ پر آب میں
گیسوءِ سنبل کا بل کھانا وہ پیچ و تاب میں
وہ گلے ملنا درختوں کا خمائرِ خواب میں
جانبِ نہرِ چمن گر یک نظر بینی کنوں
بنگری در آبِ عکسِ بیضہ سیاب گوں

مر مر میں گنبد ہیں سیمیں سائبان سر پر ترے
سرمندی انوار سے روشن ہیں بام و در ترے
فرشِ سیلابی پہ رخشاں سیمگوں اختر ترے
چاندنی کا ہے سماں اندر ترے، باہر ترے
اے صبا! از بسکہ بر گردِ جہاں گردیدہ ای
زیرِ گردوں این چنیں گلزارِ رضواں دیدہ ای؟

ایک دن تھیں ان گوں پر بلبلیں دستان سرا
نغمہٴ اقبال سے تھا یہ چمن رنگیں نوا
تاجدارانِ جہاں کا تھا یہاں اک جمگھٹا
اس در و دیوار پر تھا سایہٴ بالِ بہا
بحر و کان بود است روزے بندہٴ فرمان تو
قرۂ تحتِ سلیمان بود در ایوانِ تو

گلشنِ آرائی میں تیری باغ و صحرا مل گئے
 حلقہ پیرائی میں تیری کوہ و دریا مل گئے
 حسن و عشق و تخت و بخت و دین و دنیا مل گئے
 یاں زمین و آسمان کے کار فرما مل گئے
 پیکرِ جان پرورے چوں قدِ یار آراستند
 وز دلِ عاشق بر آن نقش و نگار آراستند

ایک عالم تھا کبھی تیری اداؤں پر فدا
 تیرے مہمانوں سے تھی یہ سر زمین مہمان سرا
 تیرہ خاک ہند کو جنتِ نشان تو نے کیا
 اس خراب آباد کو تو نے گلستان کر دیا
 آستانِ بوسہ گاہِ مانی و بہزاد بود
 گردشِ ایام لیکن بر سرِ بیداد بود

داغِ حسرت رہ گئے اس بزمِ گل کی یادگار
 لعل و یاقوت و زمرد کے ترے نقش و نگار
 حسنِ صورت سے ترے حسنِ ازل ہے آشکار
 ہے خزاں سے بھی تری پیدا وہی شانِ بہار
 از ہمدِ خوبان بہ رعنائی یگانہ بودہ ای
 وز جمالِ خویش در عالمِ فسانہ بودہ ای

سرو اور شمشاد ہیں اب حاجب و درباں ترے
 بلبل و قمری نوا سنجانِ خوش الحان ترے

حسرتوں کے ہیں مزار ایوانِ عالیشان ترے
ہیں کدھر سوتے مکین، اے خانہ، ویراں! ترے؟
ہر کہ، می آید بہ ذوقِ جلوۂ دیدار تو
اشکِ خون دارد بہ دامنِ ہدیہ، دربار تو

دل بھر آیا انقلابِ چرخِ گرداں دیکھ کر
ہستی، موہوم کا انجام و پایاں دیکھ کر
روضہ، ممتاز میں عبرت کے سامان دیکھ کر
صفحہ، دیوار پر آیاتِ قرآن دیکھ کر
می کند از گوشِ ناظرِ پنہ، غفلتِ پروں
از در و دیوارِ او آیاتِ ”لا یستأخروں“

چار دن کی سیر ہے دنیا کے مہاں کے لیے
ہے قباءِ زندگی چاکِ گریباں کے لیے
چاہیے کچھ نورِ عبرتِ چشمِ انساں کے لیے
ورنہ چشم و گوش تو یکساں ہیں حیواں کے لیے
”گا ہے گا ہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہاءِ سینہ را“

سہرے

بتقریب کتخدائی منشی سراج الدین

خان صاحب منشی سراج الدین، سابق میر منشی، رزیدنسی کشمیر، ایک مشہور اقام اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں۔ ہماری انجمن احباب، موسومہ بہ ”مفرح القلوب“ کے آپ روح و روان تھے۔ صادق علی صادق مرحوم، نور الدین عنبر مرحوم اور مرزا مبارک بیگ وغیرہ دیگر ممبران تھے۔ میری بہت سی نظمیں اسی عہد ”مفرح“ یعنی ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان لکھی گئیں۔ منشی صاحب نہایت زندہ دل، رنگین طبع اور فنافی الادب شخص ہیں اور میرے نہایت مخلص اور بے تکلف دوست۔

سر پہ نوشاہ کے زیبا ہے شہانہ سہرا
اس یگانے کو ملا کیا ہی یگانہ سہرا
کیا خوشی سے ترا گاتا ہے زمانہ سہرا
بن گیا عیش و مسرت کا ترانہ سہرا
جی میں آتا ہے آڑا لون ترے چٹ چٹ بوسے
یارِ دلدار! ذرا رخ سے آٹھانا سہرا
گاتے ہیں آج مسرت سے محبان سراج
با مزامیر و دف و چنگ و چغانہ سہرا
نغمہ سنجی میں بھی دولہا کو یہ طولے ہے
کہہ دو مطرب سے کہ سر تال سے گانا سہرا
پیارے دولہا میں دلہن کی ہیں ادائیں یکسر
اس رخ و زلف پہ سجتا ہے زنانہ سہرا

منہ سے جھڑتے ہیں ترے پھول بوقتِ گفتار
 باغ و بستان سے ضروری نہیں لانا سہرا
 طبعِ رنگیں ہے وہ نوشاہ کی ہر دم تازہ
 کہ نہ دولہا ہو پرانا، نہ پرانا سہرا
 گھورنے والوں نے نوشہ کا کیا قافیہ تنگ
 بن گیا تیرے نظر کا ہے نشانہ سہرا
 کودتے پھرتے تھے جنگل میں غزالوں کی طرح
 ان کو اب تھان پہ باندھیں، ذرا لانا سہرا
 گرمی، بزمِ ادھر، گرمی، اشعارِ ادھر
 بن گیا میری زباں پر ہے زبانہ سہرا
 ہے یہ گلزارِ جوانی کا مرقعِ ناظر
 عہدِ رنگیں کا یہ رنگیں ہے فسانہ سہرا

سہرا

بتقریب کتخدائی برخوردار فیض اللہ خاں، فرزند مصنف
 مبارک ہو، مبارک ہو تمہیں، جانِ پدر! سہرا
 ہو لطفِ ذوالجلالی کا تمہارے زیبِ سر سہرا
 سجایا ہے تمناؤں کا میرے دیدہ دل نے
 نیا تیری جبین پر ایک فردوسِ نظر سہرا
 کروں تعریف کیا، نوشاہ! تیرے عارض و خط کی
 کہ ہے حسنِ شائل سے سدا زینتِ تر سہرا

بظاہر بھول سے ہلکا مگر ہربت سے بھاری ہے
 یہ اک بار امانت ہے سرِ نوشاہ پر سہرا
 صراطِ المستقیمِ زندگی کتخدائی ہے
 چراغِ رہنما ہے شاہراہِ عمر پر سہرا
 مبارک زندگی ایسی ہو عہدِ کتخدائی کی
 کہ اس کی یاد میں گاتے رہیں دیوار و درِ سہرا
 کٹھن ہیں منزلیں اس شاہراہِ زندگی کی
 تمہیں راہِ سعادت کا ہو ہر دم راہِ سہرا
 ثمرِ شاخِ تواضع کا ہمیشہ سرِ بلندی ہے
 یہی تعلیم دیتا ہے تمہیں افگندہ سرِ سہرا
 رہو تم خندہ پیشانی بہ ہنگامِ پریشانی
 زبانِ گلفشاں سے کہہ رہا ہے جھوم کر سہرا
 معطر ہے دماغِ اہلِ محفلِ نکہتِ گل سے
 شمعِ خلق کا گویا دکھاتا ہے اثرِ سہرا
 نہ سمجھو رائگاں اس کو، بنا لو حرزِ جاں اس کو
 کہ ہے صد پندِ لقمان سے سوا یہ مختصر سہرا
 بھلے بھولے زمانے میں نسیمِ لطفِ یزداں سے
 ہو شاخِ آرزو میں کامرانی کا ثمر سہرا !
 ہو شمعِ انجمن سہرا یہ شامِ عمرِ ناظر میں !
 ہو صبحِ زندگی میں تری نورِ سحر سہرا !

سہرا

بتقریب کتخدائی برخوردار چودھری عبدالکریم

بی. اے.، سلمہ اللہ تعالیٰ

فرزند چودھری محمد بخش صاحب رئیس لاہور اور

برادر خرد چودھری فتح محمد ایم. اے.، آنریری مجسٹریٹ

رخِ نوشاہ پر اس شان سے ہے جلوہ گر سہرا

ہو جیسے عارضِ خورشید پر نورِ سحر سہرا

فروغِ سہر سے جیسے بہارِ لالہ و گل ہے

رخِ رخشاں سے ہے نوشاہ کے رخشنده تر سہرا

مبارک ہو، مرے نوشہ! تجھے یہ جشنِ نوشاہی

ترے سر پر بنا ہے آج گویا تاجِ زر سہرا

محبت کی نگاہیں ہیں ترے دیدار کی پیاسی

مرے نیچی نظر والے! ذرا اونچا تو کر سہرا

جو چاہے دیکھنا زیرِ فلک فردوسِ نظارہ :

پدر کی آنکھ سے دیکھے پسر کے زیبِ سر سہرا

برادرِ گل بداماں ہے تو مادرِ گوہر افشاں ہے

جھکی جاتی ہے پیشانی، ادھر سہرا، ادھر سہرا

وہ تیری لوحِ پیشانی پہ تحریرِ سعادت ہے

کہ لیتا ہے قدم تیرے جبین کو چوم کر سہرا

اڑے گا چرخِ رفعت پر تری ہمت کا طیارہ

ہمّاءِ اوجِ عزت کا بنے گا بال و پیر سہرا

ہے کشتِ زندگی کا یہی خرمَن، یہی حاصل
 ہے باغِ کائناتی کا شجرِ سہرا، ہر سہرا
 اسی سے عالمِ فانی میں ہے رنگِ بقا باقی
 کہ ہے آبِ حیاتِ زندگی کا خضرِ سہرا
 جہاں میں ہے اسی سے جذبِ دل کی داستانِ تازہ
 محبت کی بصیرت میں ہے "مَازَاغِ الْبَصَر" سہرا
 گلوں نے آنکھ ابھی گزارِ اسکاں میں نہ کھولی تھی
 کہ ہستی کے چمنِ پیرا نے گوندھا عرش پر سہرا
 ابھی تم گودیوں میں کھیلتے تھے، حضرت نوشہ!
 کہ ناظر کے تصور میں تھا یہ نورِ نظرِ سہرا
 وظیفہ ہے زبان پر میری "فَتَّاحُ کَرِیم" کا
 تیری شانِ کریمی سے ہو، یا رب! بہرہ ور سہرا

مناظرِ قدرت

پانی میں

مناظرِ کشمیر سے متعلق یہ میری پہلی نظم ہے جو کشمیر کی مشہور
 سیرگاہ جھیل ڈل کی شان میں لکھی گئی۔

اللہ! اللہ! ہے کیا حسنِ چمنِ پانی میں!
 سبزہ و لالہ و گلی، سرو و سمنِ پانی میں!

کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں!
 کوہ پانی میں، چمن پانی میں، بزم پانی میں!
 تودہ سیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں
 برف کہسار ہے یا عکس فگن پانی میں
 اک طرف کوہ پہ ہے تحتِ سلیماں قائم
 اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں
 جلوہ برق سے ہے نور کا عالم شب کو
 طور منظر ہے ”مہاراج بھون“ پانی میں
 عشق پیچاں ہے ادھر اور گلِ ریحاں ہے ادھر
 ہے یہ منصور تو وہ دار و رسن پانی میں
 آبِ ڈل حسن و لطافت میں ہے گر آبِ حیات
 صورتِ خضر ہے ہر شاخِ سمن پانی میں
 اک طرف پھول کنول کا وہ سجیلا بانکا
 مسکراتا ہے کھڑا غنچہ دہن پانی میں
 نیلگوں ڈل میں کنول کی وہ قباء گلرنگ
 حسن کی آگ ہوئی شعلہ فگن پانی میں
 اس کے پتوں پہ ہیں شبنم کے چمکتے قطرے
 سبز تھانوں میں ہیں یا درِ عدن پانی میں
 نچلی رہتی نہیں جس طرح کسی شوخ کی آنکھ
 کھلتی پھرتی ہے سورج کی کرن پانی میں
 سطح پر ڈل کی نظر آتا ہے قوارہ سیم
 عکس مہتاب ہو جب جاوہ فگن پانی میں

ہدیہ

یہ نظم کشمیر پہنچنے کے چند روز بعد لکھی گئی۔ مرزا سعدالدین مرحوم، (خانصاحب) مرزا غلام مصطفیٰ کے برادر محترم اور مشہور مرزا خاندان کے رئیس اور ریٹائرڈ وزیر تھے۔ اردو فارسی شعر و سخن کا آپ ذوقِ سلیم رکھتے تھے۔ آپ نے دو خوبصورت پھولدانوں میں نہایت خوش رنگ پھولوں کے دو گلدستے سجا کر ہدیہ میرے پاس بھیجے۔ اشعار ذیل اس عنایتِ خاص کے شکریہ میں لکھے گئے۔

اے میرے مکرم و معظم	ہم مشرب و ہمصفیر و ہمدم !
اے گلبن گلشنِ معانی !	اے بلبلِ باغِ خوش بیانی !
پہنچے گلدستہ ہاءِ خوش رنگ	غنچہ کی طرح کھلا دلِ تنگ
گلدان ہیں شبیہ مرغِ طیار	بلبلِ گویا ہیں گلِ بہ منقار
ہے لطفِ چمن مرے مکال میں	ہے رنگِ بہار کا خزاں میں
کیا ہدیہ سعد جاں فزا ہے !	کیا تحفہ دوست دلربا ہے !
پھولوں کو ہوں میز پر سجاتا	پھولا نہیں جامے میں سہاتا
پھولوں کا یہ دل فریب منظر	ناظر کو ہے ملکِ جم سے بہتر
ہے حسنِ بہار کی یہ تصویر	ہے عارضِ یار کی یہ تصویر
شاہد مخفی حجاب میں ہے	کاتب پنہاں کتاب میں ہے
اس روپ میں ہے کوئی سجیلا	اس رنگ میں ہے کوئی رنگیلا
گلِ گفتِ سحر گہاں بہ گوشم	من جلوۂ حسنِ گل فروشم
این رنگِ من از رخِ نگاریست	بویم ز شمیمِ زلفِ یاریست
در ہر رگِ من دویسدہ قارے	در پردہ نشستہ پردہ دارے

یک خندہ ام از لب نکوئی یک جلوہ ز حسنِ شعلہ روئی
 این حسن و جمال گل چو دیدم
 از شوق نوائے بر کشیدم

اے گل، اے شاہدِ دل آرا! اے دشت و چمن کے محفل آرا!
 تو زینتِ گلشنِ جہاں ہے تو رونقِ روضہٴ جنان ہے
 ہے بزمِ چمن میں راگ تیرا گاتی ہے صبا سہاگ تیرا
 بادل ترے سر پہ جھومتے ہیں چشمے ترے پاؤں چومتے ہیں
 : شبم موتی پرو رہی ہے اور تیری قبا کو دھو رہی ہے
 ہے صحنِ چمن میں راج تیرا زپسندہ ہے سر پہ تاج تیرا
 درباں ترا سروِ جوئباری سقا ترا ابرِ نو بہاری
 شمشاد ہے چو بدار تیرا خیمہٴ غلّی چنار تیرا
 ہے بطنِ زمیں ترا خزانہ سبزہ ہے ترا فراش خانہ
 نرگس ساقی ہے مست و مخمور مے خانہ ترا ہے شاخِ انگور
 رنگیں تیری فوج کی ہے وردی عنابی، گلابی، لاجوردی
 مرغانِ چمنِ نقیب تیرے چاؤش ہیں عندلیب تیرے
 کہسار میں، دشت میں، چمن میں نسریں میں، سمن میں، نسترن میں
 جلوہ تیرے رخ کا گُو بگو ہے پھیلی ترے گیسوؤں کی بو ہے

گلزار میں ہے نسیم تیری

کہسار میں ہے شمیم تیری

اے بزمِ جہاں سجانے والے! اے حسنِ ازل دکھانے والے!
 اے زینتِ دشت و فخرِ گلشن! اے پاک سرشت و پاک دامن!
 کاش! اے گلی خوبرو، خوش انفاس! ناظر میں بھی ہوتی تیری بو باس

معصوم تو اور پُر گنتہ میں تو سرخرو اور رو سیہ میں
 ہے گرد سے تیرا پاک دامن عصیاں سے ہے میرا چاک دامن
 تو غیروں کا دل لبھانے والا میں خوشیوں کی جان کھانے والا
 زینت تجھ سے چمن میں، بن میں وحشت مجھ سے ہر انجمن میں
 جنگل میں ہے تیرے دم سے منگل محفل میں مرے قدم سے ہل چل
 ہے موج صبا میں تیرا آنا اور دوش ہوا پہ تیرا جانا
 تم آئے چمن میں مسکراتے اور جاؤ گے ہنستے، کھلکھلاتے
 ہم آئے تھے کش مکش میں پڑ کر اور جائیں گے ایڑیاں رگڑ کر
 چوں دیدہ بہ حسن گل گارم از زشتی خوش عار دارم
 نے برگِ گلم، نہ سروِ بستان
 ”مارا بچہ کار کشتِ دہقان“

فردوسی زمین

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
 مگر عالم میں، اے گلزارِ کشمیر! کوئی خلدِ بریں تجھ سے نہ دیکھا
 ہیں حسن و عشق کے رمنے ترے باغ گل و بلبل میں یاں یارانہ دیکھا
 چمن زاروں میں آبِ جو کا منظر وہ موجِ سیم کا لہرانا دیکھا
 وہ اونچی وادیوں میں جلوۂ گل کہ باغ و راغ میں اصلا نہ دیکھا
 وہ کوہِ برف پر تنویرِ خورشید پھر ایسا آتشیں دریا نہ دیکھا
 وہ گلزاروں میں ہر سو جعدِ سنبل حریفِ گیسوۂ جانانہ دیکھا
 الگ بزمِ چمن سے سونے والا لبِ جو سبزۂ بیگانہ دیکھا

ہے ہر سرو و سمن لیلی کا محمل
 آفاق ہر وہ ضیا پاشی سحر کی
 سفیدوں کے وہ ہرچم وادیوں میں
 وہ ہر سو سیمگوں تالاب دیکھے
 کنول کے پھول ہر جس دم نظر کی
 گرے پتوں پہ جب پانی کے قطرے
 شفق کی جلوہ ریزی بادلوں میں
 وہ جاں پرور تھا کیف زعفران زار
 وہ دھانی کھیت میں شفاف پانی
 چھتوں پر لالہ و گل کا سماں تھا
 وہ ہر جانب تماشاء لب بام
 تھا صحن بوستان بزم حریفان
 کہیں تھی گرم مشتاقوں کی محفل
 سیہ چشموں کی اک ترچھی نظر سے
 اسی کیف تماشا میں سرِ شام
 سماں پھر چاندنی کا اس چمن میں
 وہ دیکھا خواب میں رنگیں مرقع
 کہ بیداری میں پھر ایسا نہ دیکھا

دھندلیکا آسمان پر چھا رہا تھا
 آٹھا تھا جھوم کر وہ گھائیوں سے
 شمیم روح پرور سے گلستاں
 چناروں کے قدِ بالا سے طوی
 زمیں پر ابر سیا لہرا رہا تھا
 خراماں وادیوں کو آ رہا تھا
 نسیم صبح کو مہکا رہا تھا
 ریاضِ خلد میں شرما رہا تھا

تھا فواروں کا ہر سو رقص پیہم تو آب جو آچھلتا جا رہا تھا
 یہ فسّارہ تھا یا سیال گلبن روپہلی پھول سے برسا رہا تھا
 یہ سیمیں سلسلہ آبِ رواں کا چمن میں چاندنی چھٹکا رہا تھا
 مقابل باغ کے تالاب ڈل کا پری کو آئینہ دکھلا رہا تھا
 وہ عالم نور کا تھا بزمِ گل پر کہ شعلہ طور کا شرما رہا تھا
 چمن میں موج زن تھا جلوۂ گل کہ سیلِ رنگ آمذا آ رہا تھا
 تھے طائرانغمہ خوان شاخ و شجر پر کہ سر تا پا گلستان گا رہا تھا
 ترنم سا ہوا میں بس رہا تھا تجمل سا فضا پر چھا رہا تھا
 صداءِ کوس و طبلِ شہریاری کہستان ہر طرف دہرا رہا تھا
 ادھر رشکِ درفشِ کاویانی شہنشاہی علم لہرا رہا تھا
 ادھر اک وارثِ اورنگِ اکبر جلوسِ خسروی فرما رہا تھا
 شہِ جم جہاں نور الدین جہانگیر شکوہ بزمِ جم دکھلا رہا تھا
 ادھر نورِ جہاں کا جلوۂ حسن در و دیوار کو چمکا رہا تھا
 فروغِ عارضِ مہرِ النسا سے جہاںِ یوسفی گہنا رہا تھا
 وہ حسن و عشق کا مغلی مرقع زمانہ کو دکھایا جا رہا تھا
 ادھر محوِ نوا سرمستِ مطرب سرودِ آسانی گا رہا تھا
 وہ تارِ چنگ و بربط کی تڑپ سے رگِ جاں میں لہو دوڑا رہا تھا
 وہ تھی دربار کی شانِ آشکارا کہ بندوں کو خدا یاد آ رہا تھا
 یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا

”اگر فردوس بر روءِ زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است“

لمودری

یہ نظم آنریبل میان شاہ دین مرحوم، سر محمد شفیع مرحوم،
شیخ سر عبدالقادر اور شیخ عمر بخش مرحوم کی پارٹی کی
سیر کشمیر کی یادگار ہے۔

کیا آب و تاب تجھ میں نہرِ لمودری ہے
پرہت کی تو ہے دیوی یا قاف کی پری ہے
آبِ حیات تو ہے، روحِ نبات تو ہے
ہے تجھ سے دل کو ٹھنڈک اور آنکھ کو تری ہے
تو کھلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں
نسرین و نسترن میں تیری مصوری ہے
گنہار وہ رنگیلی، ریحان وہ نیلی نیلی
شالی وہ پیلی پیلی، کیسی ہری بھری ہے
رخسندہ سنگ پارے، ہیں چاند یا ستارے
تیری جو کنکری ہے، الہاس سے کھری ہے
بادِ بہار تجھ پر کرتی ہے گل پخھاور
دشت و چمن نے مل کر جھولی تری بھری ہے
چشمے ترے مقطر ہیں جامِ جم سے بڑھ کر
شاخ و شجر سے سر پر سدِ سکندری ہے
برقاب سے لبالب ہر دم ترا ہے ساغر
ساقیٰ بزم تیرا خورشیدِ خاوری ہے
حسن و جمال تیرا، غنچ و دلال تیرا
ہر خط و خال تیرا طغراءِ دلبری ہے

ہے تیری دھن نرالی، کیا دل لبھانے والی
 جنگل میں کوئی جوگن محو نوا گری ہے
 ناظر کی ہیں نظر میں تیری ادائیں پیاری
 کچھ تجھ سے ملتی جلتی روداد ہے ہماری

ہم دونوں جاہد پیا صبح و سہا رہے ہیں
 بے راہبر رہے ہیں، بے رہنما رہے ہیں
 آفاق گرد دونوں، صحرا تورد دونوں
 ٹیلوں میں، جنگلوں میں چکر لگا رہے ہیں
 اپنی الپ پر ہیں ہم دونوں مست و شیدا
 سر دھن رہے ہیں خود ہی اور خود ہی گاہ رہے ہیں
 بانگِ جرس ہیں خود ہی اور خود ہی کارواں ہیں
 کوسِ رحیل اپنا ہر دم بجا رہے ہیں
 نے کوئی ہم زباں ہے، نے کوئی راز داں ہے
 پربت کی گھاٹیوں کو دکھڑے منا رہے ہیں
 ہارے تھکے جو رہرو منزل میں سوکھے ہیں
 خوابِ گراں سے ان کو ہر دم جگا رہے ہیں
 یہ بے خودی و مستی وہی ہے اور آستی
 روزِ ازل کے کیفی سرخوش سدا رہے ہیں
 ہم گل کے ہم نفس ہیں، بادِ صبا کے ہمدم
 مرغابِ خوش نوا کے ہم ہمنوا رہے ہیں
 گردن کشوں سے دونوں ہم کوسوں بھاگتے ہیں
 جانبِ فروتنوں کی خود کھچتے جا رہے ہیں

اے اہل شہر! تم سے مل کر ہوئے مکڈر
 صحرا نوردیوں میں ہم باصفا رہے ہیں
 قدرت کے شاہدوں کے ہم دونوں ہیں مصوّر
 جو صورتیں ہیں دیکھی، سب کو دکھا رہے ہیں
 آئینہ وار بر دل نقش و نگار داریم
 ہم شورہ بوم داریم، ہم لالہ زار داریم

ہم گُو بہ گُو پھرے ہیں اور جا بجا رہے ہیں
 تحت الثریٰ رہے ہیں، فوق السما رہے ہیں
 آونچی تھی اپنی بستی لیکن یہ غول ہستی
 سوء حسیضِ بستی ہم کو گرا رہے ہیں
 آفت کا سامنا ہے یاں سیدھی راہ چلنا
 منہ آ کے پتھروں پر ہم منہ کی کہا رہے ہیں
 میں گرم رہ نوردی، گو اس سے بے خبر ہیں
 آئے تھے کس طرف سے، کس سمت جا رہے ہیں
 دل جس جگہ لگانا، واں لوٹ کر نہ آنا
 کیا داغ حسرتوں کے ہم دل پہ کہا رہے ہیں
 جو دلکشا نظارے نظروں سے چھپ چلے ہیں
 حسرت بھری نگاہیں آن پر آٹھا رہے ہیں
 ہے آب و تاب اپنی اہل جہاں پہ ظاہر
 پر زخم اندروں کو سب سے چھپا رہے ہیں
 جن رہروں کی لہندیں غم نے آچاٹ کر دیں
 ہم میٹھی لوریوں سے آن کو سلا رہے ہیں

وہ مانے یا نہ مانے لیکن جییں کو اپنی
 جاناں کے سنگِ در پر ہر دم گھسا رہے ہیں
 اک بحرِ یسکراں میں اپنا نشان کریں گم
 گرتے، اچھلتے، پڑتے، اس دھن میں جا رہے ہیں
 اے موجِ یم، خدارا! تیور پہ بل نہ لانا
 خود سر کے بل ترے ہم قدموں میں آ رہے ہیں
 ناظر ز منزلِ دوست نام و نشان ندانیم
 در شوقِ راہِ پیمِ دنبالِ کاروانیم

مطائبات

کانگری

یہ نظم بھی عہدِ ”مفرح“ کی یادگار اور ”جوگی“ کی ہم عمر ہے۔
 نظرائی میں چند اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اے مری آرامِ جاں! اے میری دلبرِ کانگری!
 مہرِ انورِ کانگری! ماہِ منورِ کانگری!
 وادیٰ کشمیر پر ہے وادیٰ ایمن کو رشک
 دیکھ کر جلوہ ترا، اے طورِ منظرِ کانگری!
 قوتِ بازو جوان کو اور عصا ہے پیر کو
 بچہ* کشر* کو ہے پستانِ مادرِ کانگری

بطنِ مادر میں رہی پہلو میں اکثر کانگری
 بعدِ مردن نورگستر تھی لحد پر کانگری
 خلد میں کشمیر والوں کا رہے گا جی آچاٹ
 گر نہ آس جنت میں پہنچی حورپیکر کانگری
 آستیں میں کانگری ہے ، زیرِ داماں کانگری
 کانگری زیرِ عبا ہے ، زیرِ چادر کانگری
 خانہ آبادی زمستان میں اسی کے دم سے ہے
 شوہر بانو ہے اور بانو شوہر کانگری
 باغی اور باغجن میں باہم گر کبھی چھڑ جائے جنگ
 روکتی ہے ہمتلو* کا حملہ اکثر کانگری
 داغ دیتی ہے دلوں پر اپنے دیوانوں کے یہ
 شب کو جب پہلو بدلتی ہے پھل کر کانگری
 آس کا دامن گیر ہے کشمیر کا میر و وزیر
 ہے نشاطِ مفلس و عیشِ تونگر کانگری
 تختہٴ صندل کو دیتی ہے یہ رنگِ آبنوس
 سنگِ موسیٰ سے بدل دیتی ہے مرمر کانگری
 آتشِ رخ سے وہ گرماتی ہے اہل بزم کو
 گلہ ساقی کانگری ہے ، گلہ ساغر کانگری
 عاشقیِ دل سوختہ کا ہے مزارِ گنبدی
 یا نگارِ شعارو کا حجلہٴ زر کانگری
 لن ترانی دیکھ کر فصلِ زمستان میں تری
 چھپ گیا خورشیدِ خاور مثلِ شپر، کانگری !
 *کشتی چلانے کی لکڑی .

گر لشکرِ عدو کی ہو سلطنت پہ یورش
میدان میں سربکف ہے ہر نوجوان ہمارا
جب شرق و غرب میں تھا طوفانِ جنگ برپا
گزرا سمندروں سے سیلیِ رواں ہمارا
فضلِ خدا پہ ہر دم یاں آنکھ لگ رہی ہے
ابرِ کرم ہے اس کا روزیِ رساں ہمارا
قدرت کے منظروں میں ہم پھلتے پھولتے ہیں
ناظرِ رواں رواں ہے تسبیحِ خواں ہمارا

غزلیات

کوئی شمع اور کوئی پروانہ ہوگا جہاں میں عشق کا افسانہ ہوگا
جنونِ عشق سے ہے لطفِ بستی وہ دیوانہ ہے جو فرزانہ ہوگا
ترے مستوں کا، اے کوثر کے ساقی! وہی یہاں، وہی پیانہ ہوگا
خراباتِ جہاں وقفِ فنا ہے مگر باقی ترا میخانہ ہوگا
رواں ہیں کارواں جس کی طرف سب یہی وہ کوچہٴ جانانہ ہوگا
وہ دل ہی کیا کہ رقصِ موج جس کا حریفِ جنبشِ دریا نہ ہوگا
وبالِ دوش ہے وہ سرکہ جس میں کسی کے عشق کا سودا نہ ہوگا
جسے شہد و شکر کی آرزو ہے لبِ نوشین کا وہ رسیا نہ ہوگا
محبت کے ہیں رنگا رنگ نیرنگ کہیں افسوں، کہیں افسانہ ہوگا
پرستاری ہے طینت میں بشر کی جہاں کعبہ نہیں، بت خانہ ہوگا

پیاسی سے کسی نے کہا دیا ہے

کہ ناظر سے کوئی پروانہ ہوگا

تن بدن میں آن کے فوراً رشک سے لگ جائے آگ
 قاف کی پریاں جو دیکھیں تیرے شہر، کانگری !
 باغ میں حیراں ہے نرگس چشمِ فتاں سے تری
 رشکِ سنبل ہے تری زلفِ معنبر، کانگری !
 بن سنور کر جا رہی ہے سیرِ گلشن کو مگر
 چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں، ماتھے پہ جھومر، کانگری !
 ناف میں تیری نہاں ہے نفاق، آہو چیں
 ہے رگ و ریشہ میں تیرے عود و عنبر، کانگری !
 ابر و باراں میں فزوں ہے کانگری کی آب و تاب
 برف کے دریا میں ہے ہر سو شناور کانگری
 ہے اندھیری غار میں اک راہبِ روشن ضمیر
 یا عبا کی ظلمتوں میں نور گستر کانگری
 اس کے سینے میں نہاں ہے جلوۂ نورِ ازل
 معبدِ زردشت ہے، معبودِ آذر کانگری
 ابر کے پردے میں گردش کر رہا ہے آفتاب
 یا پھرن* کے پھیر میں کھاتی ہے چکر کانگری
 مدرسہ میں ہے نواسنجِ گلستان، بوستان
 خاقانہ میں بحرِ عرفاں کی شناور کانگری
 عرش سے آس پر اترتے ہیں مضامینِ بلند
 رات کو رکھے بغل میں گر سخنور کانگری
 واعظوں کو بھی بدانت میں یہی ہے رہنا
 لیڈروں کو بھی سیاست میں ہے رہبر کانگری

خطہ کشمیر میں تو شاد ہو، آباد ہو
 لال رکھے تجھ کو دائم رب اکبر، کانگری !
 منتظر مدت سے ناظر بھی ہے اس دن کے لیے
 جب گورنر کانگری ہو اور منسٹر کانگری
 حال پر اس کے رہے سرکار کا الطاف خاص
 تیری بندی دل سے ہے، اے شاہ کشور! کانگری
 شکر احسان سے ترے غافل تھے اہل کشمیر
 اس لیے ناظر بنا تیرا ثناگر، کانگری !

روٹیاں

میرے قیام لداخ کے زمانہ میں خان صاحب شیر محمد خان مرحوم ،
 پولیٹیکل آفیسر، نے یہ روٹیاں ہدیہ مجھے بھیجی تھیں ۔
 اشعار ذیل میں اس عنایت کا اعتراف کیا گیا ہے ۔

خان صاحب نے ہیں بھیجی روح پرور روٹیاں
 عرش پر پہنچا دماغ اپنا یہ کھا کر روٹیاں
 روٹیاں پیرانگر کی گو بہت مشہور ہیں
 خان صاحب کی مگر ہیں آن سے بڑھ کر روٹیاں
 بھینی بھینی آن کی خوشبو، میٹھا میٹھا ذائقہ
 مشک اذفر روٹیاں، قند مکرر روٹیاں
 شرم سے کیونکر ڈبل روٹی نہ یوں گھلنے لگے
 نرم ہیں ریشم کے لچھوں سے یہ بڑھ کر روٹیاں

رشک سے اُن کے جلے کیونکر نہ قرصِ آفتاب
 اُس کی روئی خشک ہے اور آب کی تر روٹیاں
 شیرمال اِن روٹیوں کے سامنے کیا مال ہے
 وہ تو شیرِ گاؤ ہے ، یہ شیرِ مادر روٹیاں
 اِن کی خوشبو سے معطر ہو گیا اپنا دماغ
 ہیں مگر یہ مشک و عنبر سے مخمّر روٹیاں
 ”قل ہو اللہ“ آنتیں اِن کو دیکھ کر پڑھنے لگیں
 ہیں سبقِ اخلاص کا دیتی مقرر روٹیاں
 دم قدم سے اِن کے ہے تقریر بھی ، تحریر بھی
 ہیں پلیڈر روٹیاں ، قوموں کی لیڈر روٹیاں
 سفرۂ گردوں پہ ہے جب تک کہ نانِ آفتاب
 خوان پر ہوں خان صاحب کے فزوں تر روٹیاں!
 دیکھیے اب بندۂ ناظر کا کیا انجام ہو
 خلد سے آدمؑ تو نکلے تھے یہ کھا کر روٹیاں

متفرقات

انقلاب

دورِ گردوں میں نیا اک انقلاب آنے کو ہے
 میکدہ میں محتسبِ مستِ شراب آنے کو ہے
 تاجِ سلطانی پہ اب وہ ظلِ سبحانی نہیں
 خسروی زیرِ لواءِ انتخاب آنے کو ہے

ٹھٹھ گئی سرمایہ داری اور مزدوری میں جنگ
 دیکھیں کون اس معرکہ سے کامیاب آنے کو ہے
 اب دلوں سے راحت و صبر و سکون جانے کو ہے
 احتیاج و احتجاج و اضطراب آنے کو ہے
 بن گیا ہے کارزارِ زندگی میدانِ حشر
 ایک نیزے پر مگر اب آفتاب آنے کو ہے
 عہدِ حاضر جس کو کہتے ہیں ترقی کا کفیل
 کیا اسی پر اب تنزل کا عذاب آنے کو ہے؟
 کارواں، آفتاں و خیزاں، دشت میں ہے تشنہ لب
 دیکھیں آبِ زندگی یا سراب آنے کو ہے
 ہو گیا جوشِ عمل برہم، زنِ بزمِ خیال!
 آسمانِ پیر میں زورِ شباب آنے کو ہے
 دب گئی ہے بیندِ باجی سے صدائے ارغنون
 بہرِ پا بوسِ دہل، چنگ و رباب آنے کو ہے
 آ رہا ہے خود نمائی، خود فروشی کا جلوس
 شعلہ خونی، جنگِ جوئی ہمرکاب آنے کو ہے
 اہل تقویٰ، اہل دیں، اہل یقین کی شان میں
 سادہ لوحی کا زسائے میں خطاب آنے کو ہے
 تولیے جائیں گے ترازو میں شکم کے خیر و شر
 طرفہ معیارِ صواب و ناصواب آنے کو ہے
 دل کہ شمعِ طور تھا، بے نور ہو جانے کو ہے
 جوہرِ تیغِ زباں میں آب و تاب آنے کو ہے

ہے حسینوں کا نئے فیشن میں عریانی لباس
 حسن بزمِ عشق میں اب بے نقاب آنے کو ہے
 خیرہ کر دے گا نظر کو شعلہ زارِ حریت
 بے حجابی کا نگاہوں پر حجاب آنے کو ہے
 کاش شیخ و برہمن مل کر کریں کچھ روک تھام
 ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آنے کو ہے
 بلبل و قمری گستاں میں رہیں ہم داستان
 ورنہ کوہستان سے چنگالِ عقاب آنے کو ہے
 خانہ جنگی سے کٹے مرتے ہیں بھارت کے سپوت
 ناظر اس منظر سے باچشمِ پرآب آنے کو ہے

مناظرہ لیڈر و شاعر

کہا لیڈر نے شاعر سے ، بہت شیریں نوا تم ہو
 مگر بازارِ عالم میں تو جنسِ ناروا تم ہو
 تصور میں ہو روز و شب رخ و زلفِ خیالی کے
 مگر ذوقِ حقائق سے عجب نا آشنا تم ہو
 نہ منزل کی خبر تم کو، نہ شوقِ جادہ پیمائی
 مگر اک کاروانِ رفتہ کی بانگِ درا تم ہو
 بیانِ حالی و قالی ہے سب تقلید و نقالی
 گہے رندِ خراباتی ہو، گلے پارسا تم ہو

محبت ہے تو بازاری، مذاقِ عشق سے عاری
 رقیبوں سے سرِ بازار سرگرمِ وِغا تم ہو
 ہوئیں زنجیرِ پا شاعر کی کچھ مخصوص تشبیہیں
 کمندِ زلفِ پیچاں میں گرفتارِ بلا تم ہو
 تمہارا سب تخیلِ پرتوِ اوہامِ باطل ہے
 ہمیشہ سرحدِ علمِ یقین سے ماورا تم ہو
 براتِ شاعرِ معجزیاں ہے بادِ پیمائی
 نسیمِ صبح کے ہمدم ہو، ہمزادِ صبا تم ہو
 نہیں مقصودِ دنیا میں کوئی شاعر کی ہستی کا
 مگر سرمستِ تحسین و صداۂ مرحبا تم ہو
 قرارِ اک دم نہیں اہلِ سخن کو فرشِ خاکی پر
 کبھی تختِ الثریٰ تم ہو، کبھی فوقِ السہا تم ہو
 زباں پر آپ کی ہر دم ہے قبل از مرگ واویلا
 اجل کا تم ہو فرمان اور منشورِ قضا تم ہو
 تمہاری زندگی دنیا میں اک ماتمِ مسلسل ہے
 کہ ہر دم تازہ اک کرب و بلا کی کربلا تم ہو
 ہمارے دم قدم سے ہے بنی آدم کی بیداری
 مگر غفلت کے پیاروں کو خواب اور دوا تم ہو
 زمانِ جاہلیت کے اگر تابندہ اختر تھے
 تو برقِ قمقموں میں آج مٹی کا دیا تم ہو
 سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس دارِ الحوادث میں
 مریضانِ سخن! کس درد کی آخر دوا تم ہو

کہا شاعر نے لیڈر سے کہ بے مہر و نشان ہم ہیں
 مگر ملکِ سخن میں تاجدارانِ جہاں ہم ہیں
 سوادِ دشت و صحرا میں سراپِ جانِ ستانِ تم ہو
 فضاءِ گلشن و کہسار میں آبِ رواں ہم ہیں
 ہمارے دم سے ہے باغِ جہاں کی نغمہ پیرائی
 نواءِ بلبلانِ ہم ہیں، سرودِ قدسیاں ہم ہیں
 جہانِ فتنہ و شورِ قیامت ہے جہاں تم ہو
 مقامِ اتحادِ قوم و ملت ہے جہاں ہم ہیں
 مصافِ دہر میں خنداں ہو تم گر قتلِ انساں پر
 تو مورِ ناتواں کی موت پر اشکِ رواں ہم ہیں
 اگر برقی جہان و اضطرابِ جاوداں ہو تم
 تو ابرِ رحمت و تسکینِ جانِ تشنگاں ہم ہیں
 ازل سے تا ابد ہرگز جو بھولی ہے، نہ بھولے گی
 محبت کی وہ رنگیں داستانِ پاستاں ہم ہیں
 ادیبِ اولیں ہم ہیں دبستانِ محبت کے
 بنی آدم کو درسِ آموزِ سرِ دلبراں ہم ہیں
 مبصرِ صنعِ قدرت کے، مصورِ حسنِ فطرت کے
 گلوں کے ہم نفس ہیں، بلبلوں کے ہمزباں ہم ہیں
 جہاں میں خوشہ چینِ خرمینِ پیشینیاں ہم ہیں
 قدامت کی امانت کے امین و پاسباں ہم ہیں
 جو قسامِ ازل نے روح پھونکی جسمِ انساں میں
 تپش سے آس شرارِ عشق کی آتش بجاں ہم ہیں

سہا سکتے نہیں ہرگز جو عقل کور باطن میں
 وہ کچھ اسرارِ وجدانی ہیں جن کے رازداں ہم ہیں
 ہیں پرتو عالمِ فانی میں نورِ لایزال کے
 ازل کے نکتہ داں ہم ہیں، ضمیرِ کن فکاں ہم ہیں
 کلامِ کبریا ہم ہیں، سلامِ انبیا ہم ہیں
 میانِ عرشی و فرشی پیامِ جاوداں ہم ہیں
 شعاعِ نور ہیں اور رہنماءِ رہرواں ہم ہیں
 چراغِ طور ہیں اور مشعلِ روشنِ دلاں ہم ہیں
 مثالی قطرہٗ ناچیز گو لرزاں ہوا میں ہیں
 دما دمِ تشنہٗ کامِ وصلِ بحرِ بیکراں ہم ہیں
 ہو کعبہ یا ہو بت خانہ، محبت کا ہے کاشانہ
 پرستارِ خدا ہم ہیں، ہوادارِ بتاں ہم ہیں
 مٹا سکتے نہیں جن کو حوادثِ دورِ گردوں کے
 وہ لوحِ دہر پر نقش و نگارِ جاوداں ہم ہیں
 صلاۃ عام ہے ناظرِ خریدارانِ آفت کو
 نمائشِ گاہِ* دوراں میں محبت کی دکان ہم ہیں

* یہ نظم سالانہ نمائش سری نگر کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔

زمیندار کا گیت

بتقریب جلسہ ، زمیندار ہائی سکول ، گجرات

پیارا وطن ہمارا ، جانبِ جہاں ہمارا
ہندوستان ہمارا ، جنتِ نشان ہمارا
بھیل اور گونڈ ان میں ریوڑ چرا رہے تھے
ان وادیوں میں آترا جب کارواں ہمارا
ویرانوں میں تھا اپنا یاں رات دن بسیرا
جب سر پہ آسماں تھا بس سائبان ہمارا
ان جنگلوں میں گر ہم گلکاریاں نہ کرتے
جنتِ نشان نہ ہوتا ہندوستان ہمارا
آکر بسے ہم اس میں اور اس کو بھی بسایا
ہندوستان کے ہم ہیں ، ہندوستان ہمارا
فرزندِ اقلین ہیں ہم مادرِ وطن کے
ہے یہ زمین ہماری ، یہ آسماں ہمارا
اس قصرِ دلکشا کی بنیاد ہم نے ڈالی
برسنگ و خشت پر ہے نام و نشان ہمارا
کھیتوں میں بچھ رہا ہے ہر سمت خوانِ یغا
اور شاہ سے گدا تک ہے میمہاں ہمارا
قلب و دغل سے خالی ہے اپنی طبعِ صافی
ہے جس طرح مصفا آبِ رواں ہمارا
راجا کی ہم ہیں کھیتی ، پرجا کا ہم ہیں خرمن
سود و زیاں ہے سب کا سود و زیاں ہمارا

گر لشکرِ عدو کی ہو سلطنت پہ یورش
میدان میں سربکف ہے ہر نوجوان ہمارا
جب شرق و غرب میں تھا طوفانِ جنگ برپا
گزرا سمندروں سے سیلِ رواں ہمارا
فضلِ خدا پہ ہر دم یاں آنکھ لگ رہی ہے
ابرِ کرم ہے اس کا روزی رساں ہمارا
قدرت کے منظروں میں ہم پھلتے پھولتے ہیں
ناظرِ رواں رواں ہے تسبیحِ خواں ہمارا

غزلیات

کوئی شمع اور کوئی پروانہ ہوگا جہاں میں عشق کا افسانہ ہوگا
جنونِ عشق سے ہے لطفِ ہستی وہ دیوانہ ہے جو فرزانہ ہوگا
ترے مستوں کا، اے کوثر کے ساقی! وہی بیباں، وہی پیانہ ہوگا
خرابیاتِ جہاں وقفِ فنا ہے مگر باقی ترا میخانہ ہوگا
رواں ہیں کارواں جس کی طرف سب یہی وہ کوچہٴ جانانہ ہوگا
وہ دل ہی کیا کہ رقصِ موج جس کا حریفِ جنبشِ دریا نہ ہوگا
وبالِ دوش ہے وہ سر کہ جس میں کسی کے عشق کا سودا نہ ہوگا
جسے شہد و شکر کی آرزو ہے لبِ نوشیں کا وہ رسیا نہ ہوگا
محبت کے ہیں رنگا رنگ نیرنگ کہیں افسوں، کہیں افسانہ ہوگا
پرستاری ہے طینت میں بشر کی جہاں کعبہ نہیں، بت خانہ ہوگا
پیاسی سے کسی نے کہا دیا ہے
کہ ناظر سے کوئی پروانہ ہوگا

جو نیشِ غم سے بے پروا نہ ہوگا تمھارا چاہنے والا نہ ہوگا
 جو تیری یاد میں آنسو بہے گا وہ جاناں! گوہرِ یک دانہ ہوگا
 حسین و مہ جبین ہونگے جہاں میں مگر کافرادا تجھ سا نہ ہوگا
 ہے تو پردہ میں اور شوراک جہاں میں یہ پردہ جب اٹھا پھر کیا نہ ہوگا
 تڑپ جس دل میں یزداں کی نہ ہوگی تو ابریمن کا وہ کاشانہ ہوگا
 گلستانِ آج سرمستِ نوا ہے چمن میں جلوۂ جانانہ ہوگا
 نہ ہو شاعر جو شمعِ بزمِ ہستی جہاں میں عشق کا جلوہ نہ ہوگا
 نہ ہوں گے ہم نواسنجِ بہاراں تو گلزارِ جہاں ویرانہ ہوگا
 نہ چھیڑیں ہم اگر تارِ رگِ جاں نوا زندگی پیدا نہ ہوگا
 رخِ زیبا کی تصویرِ خیالی
 ترے ناظر کا یہ نذرانہ ہوگا

یہ غزل بھی شاہدینِ پارٹی کی یادگار ہے (دیکھیں صفحہ ۵۴)

یوں فاش انجمن میں رازِ نہاں نہ کرتے
 اے کاش اہل دل کو اہل زباں نہ کرتے!
 انسان کا رازِ ہستی ہوتا جو تنِ پرستی
 اس خاک میں مخمرِ روح و رواں نہ کرتے
 گر جانتے جوانی ہے ایک نقشِ فانی
 یہ فخر و لہرِ ترانی یوں نوجوان نہ کرتے
 گر جانتے کہ غم سے ممکن نہیں رہائی
 راحت کی یاں تمنا اہلِ جہاں نہ کرتے

جو خزاں چمن کو تاراج کر رہا تھا
 کیوں باغ میں عنادل شور و فغاں نہ کرتے؟
 دار الفنا میں ملتیں حضرت کو گر یہ حوریں
 جنت کو شیخ فانی نقلِ مکاں نہ کرتے
 بت خانہ میں خدا کا جب جلوہ دیکھتے تھے
 کیوں، شیخ جی ! برہمن عشقِ بتاں نہ کرتے؟
 جب دختِ رز کو حسرتِ زاہد فریب بخشا
 پھر اس پہ محتسب کو یوں پاسباں نہ کرتے
 لکھا تھا گر قفس میں بلبل کا آب و دانہ
 آفت میں گل کی اس کو یوں نغمہ خواں نہ کرتے
 بخشی تھی جب بشر کو یہ روحِ عرشِ پیا
 اس نفسِ دوں کو اُس پر پھر حکمراں نہ کرتے
 مرکز نہ ان کا ہوتا گر آستانِ کسی کا
 یوں صبح و شام چکرِ سات آسماں نہ کرتے
 گر کاروانِ ہستی منزل سے بے خبر تھا
 ساتھ ایسے قافلے کے مجھ کو رواں نہ کرتے
 اُس دلربا کو لایا یاں طالعِ بہایوں
 ہم نقدِ جان و دل کو کیوں ارمغان نہ کرتے
 زندوں کی انجمن میں گر محتسب نہ آتے
 اس طرح مے کشی کی رمزیں بیاں نہ کرتے
 خورشیدِ حشر ہوتا نظارہ سوزِ ناظر
 سر پر شفیعِ عالمؐ گر سائبان نہ کرتے

اس غزل کا تغزل سے کوئی علاقہ نہیں۔ حیاتِ ثانیہ کے شاعرانہ خواب کی تعبیر ہے۔

کیا اپنا حال، یا رب! انجامِ کار ہوگا
 جب زندگی کا بیڑا دریا سے پار ہوگا؟
 اُس نوشِ جاوداں میں کیا نیشِ غم نہ ہوگا؟
 گلشن میں خندہ گل بے بیمِ خار ہوگا؟
 دلکش فضا میں ہوں گی، ٹھنڈی ہوائیں ہوں گی
 یا آندھیوں کا واں بھی گرد و غبار ہوگا؟
 فردوس میں رہے گا نورِ سحر ہمیشہ
 یا واں بھی اختلافِ لیل و نہار ہوگا؟
 ہوں گے یہی ستارے سر پر وہاں ہمارے
 اور اپنی قسمتوں کا ان پر مدار ہوگا؟
 بزمِ خیال کا یہ نقشہ جہاں رہے گا
 نقاشِ فکر واں بھی مصروفِ کار ہوگا؟
 نوعِ بشر میں باہم واں آشتی رہے گی
 یا یہ مصافحہ ہستی اور کارزار ہوگا؟
 خلدِ بریں میں ہوگا پست و بلند یکساں
 یا ناتواں قوی کا واں بھی شکار ہوگا؟
 آفت کا غم نہ ہوگا، فکرِ شکم نہ ہوگا
 جنت میں تیری، واعظ! کیا کاروبار ہوگا؟
 طاعت کی مُزد لے کر کیا زاہدِ ربانی
 جنت کی نعمتوں کا سرمایہ دار ہوگا؟

عشقِ بتاں میں، واعظ! کی جس نے حق پرستی
 اُس بندہ خدا کو جنت میں بار ہوگا؟
 جنت کی حور ہوگی مرمر کی مورتی سی
 یا حسن و عشق کا بھی کچھ کاروبار ہوگا؟
 واعظ! تجھے بتا دوں رازِ نہفتہ لیکن
 باتوں کا میری تجھ کو کیا اعتبار ہوگا؟
 ہے یہ تری زباں پر جو جنت اور جہنم
 یہ قہرِ یار ہوگا، وہ لطفِ یار ہوگا
 عمرِ رواں کی کشتی جب جا لگی کنارے
 اک بحرِ بیکراں میں اس کا گزار ہوگا
 یہ شمعِ زندگانی، یہ نورِ غیرفانی
 آئندہ محفلوں میں پھر جلوہ بار ہوگا
 جس پھول کو خزاں نے ہے خاک میں ملایا
 گلشن کا فصلِ گل میں پھر تاجدار ہوگا
 نیساں کا ایک قطرہ جو گم ہوا صدف میں
 پھر اُس سے نقشِ ہستی گوہرنگار ہوگا
 جو آبِ جو چمن سے دریا میں جا گرا ہے
 دریا سے پھر ابھر کر ابرِ بہار ہوگا
 ہے دورِ زندگانی اک سرِ جاودانی
 پنہاں جو آج ہوگا کل آشکار ہوگا
 اُس وصل کی گھڑی کا، ناظر! میں منتظر ہوں
 جب چشمِ شوق ہوگی اور روءِ یار ہوگا

انجمن مفرح القلوب کی فرمائش سے امیر خسروؒ کی ایک غزل پر لکھی گئی۔

چہ زلفش بہ رخسارے آویخت است کہ مارے بہ گلزارے آویخت است
 بہ ہیں خال ہندو و زلفِ دراز مگر دزدے از دارے آویخت است
 وجودم ربایست در یادِ دوست کہ ہر رگ ازوتارے آویخت است
 دلم گشتہ در بندِ زلفش اسیر چو منصورے از دارے آویخت است
 غم و شادمانی بہم در ستیز بہ دامنِ گل خارے آویخت است
 تو از یار و اغیار بیگانہ باش کہ ہر یار با یارے آویخت است
 خوشا تاجرِ اشتہار آفریں کہ خود را بہ بازارے آویخت است
 منہ دل بہ گفتارِ ناصح کہ او خودش دل بہ دلدارے آویخت است
 بہ کشمیر ناظر چنان دل بیاخت
 کہ بلبل بہ گلزارے آویخت است

نئے نیرنگ دکھلاتا ہے یہ چرخ کہن کیا کیا
 جہاں میں گل کھلائے گی ابھی خاکِ چمن کیا کیا
 مٹیں زیرِ فلک کیا کیا رفیع الشان تعمیریں
 جہاں میں درسِ عبرت ہیں یہ آثارِ کہن کیا کیا
 آجڑ کر بستیاں شکلِ بیاباں ہو گئیں کیا کچھ
 بیاباں لالہ و گل سے ہوئے رشکِ چمن کیا کیا
 جہاں کی سربلندی کا مالِ کار پستی ہے
 نشاط و عیشِ منعم پر ہے مفلس خندہ زن کیا کیا
 اسی حسنِ ازل کی لوحِ عالم پر ہیں تحریریں
 وہی اک عشق کا مضمون ہے ، اندازِ سخن کیا کیا

جہاں یوسفی محبوب تھا زنداں کی ظلمت میں
 مگر پھیلی جہاں میں آس کی بوہ پیرہن کیا کیا
 ابھی ہے منتظر منصور کا ہنگامہ ہستی
 جہاں میں تازہ ہوگا قصہ دار و رسن کیا کیا
 بچھے جاتے ہیں، اے سروِ خراماں! سیرِ گلشن میں
 مثالِ سبزہ قدموں میں ترے سرو و سمن کیا کیا
 کھڑے ہیں منتظر رہ میں تری آنکھوں کے متوالے
 وہ خوبانِ خُتا کیا کیا، غزالانِ خُتن کیا کیا
 ابھی سے رہ نورِ شوق ہمت ہار بیٹھے ہیں
 گزرنی ہیں ابھی تو گھائیاں اُن کو کٹھن کیا کیا
 بہاریں گلشنِ ہستی کی ناظرِ جاوداں ہوں گی
 رہیں گی اس گلستاں میں عنادلِ نغمہ زن کیا کیا

نگاہِ لطف کبھی گروہِ مستِ ناز کرے
 نیازمند کو عالم سے بے نیاز کرے
 وہ سرِ نوشتِ جبین پر بجا ہے ناز کرے
 جو آستان پہ ترے سجدہ نیاز کرے
 نہ تیرے چاہنے والوں میں ہو یہ جنگ و جدل
 اشارہ گر نہ تری چشمِ فتنہ ساز کرے
 بچھائیں پیاس کہاں جا کے تیرے مستانے
 جو، ساقیا! درِ میخانہ تو نہ باز کرے
 جہاں میں شور ہے اور وہ نگار پردے میں
 عجب ہو سیر جو وہ رخ سے پردہ باز کرے

نہیں وہ لذتِ آزارِ عشق سے آگاہ
 ستم میں اور کرم میں جو امتیاز کرے
 جو چاہے گرمیٰ ہنگامہ بزمِ دوراں میں
 صدا بلند کرے اور زباں دراز کرے
 جو بزمِ آنس میں چاہے کہ شمعِ محفل ہو
 تو دل میں عشق سے پیدا ذرا گداز کرے
 انہیں کے حسن سے ہے گرم عشق کا بازار
 دعا خدا سے ہے عمرِ بتاں دراز کرے
 فسانہ گو سے کہو: مختصر ہو قصہٴ جم
 حدیثِ گیسوۂ جانان ذرا دراز کرے
 یہ سلسلہ غمِ دوراں کا ہے ابد پیوند
 سکونِ دل کا جو چاہے وہ ترکِ آزار کرے
 خدا کا نام بھی لو، بازوؤں سے کام بھی لو
 تو فکرِ کارِ خداوندِ کارساز کرے
 ہوا و حرص سے ناظر رہے ہو پاک نظر
 تو ہمسری نہ حقیقت کی کیوں مجاز کرے

ہمدمو! لطفِ شبانہ ہو چکا عیش و عشرت کا زمانہ ہو چکا
 اب غم و شادی سے آزادی ملی رنج و راحت کا زمانہ ہو چکا
 نجد میں آوارہ کیوں پھرتا ہے قیس محملِ لیلیٰ روانہ ہو چکا
 منزلِ دل میں تھیں کیا کیا حسرتیں قافلہ یہ بھی روانہ ہو چکا
 زندگی غم کی کہانی رہ گئی عیش کا رنگیں فسانہ ہو چکا

ہو گئی ویراں وہ بزمِ میکہ دورِ ساغر کا زمانہ ہو چکا
 اب نہیں بزمِ چمن رنگیں نوا عندلیبوں کا ترانہ ہو چکا
 مطربِ ایام نے بدلا ہے ٹھاٹھ شوق کا چنگ و چغانہ ہو چکا
 موجِ مضطر کو ہوا آخر قرار شورِ طوفاں کا زمانہ ہو چکا
 ناظر اب ذوقِ نظریہ کار ہے
 منظرِ ہستی پرانا ہو چکا

بتقریب شاعرہ ، انجمن ذوق ادب ، ریاست رام پور

منعقدہ ۲۶ جنوری ۱۹۲۸ء

مست و بیخود تیرے میخانے کا بام و در بنے
 ساقیا! گر تیری چشمِ مست کا ساغر بنے
 حرص کے صحرا میں جو جھونکا چلے صرصر بنے
 عشق کے دریا میں جو قطرہ گرے گوہر بنے
 بت بنے ، کعبہ بنا ، مسجد بنی ، مندر بنے
 عشق کی دنیا میں کیا کیا دلربا منظر بنے
 درسِ عبرت دورِ دوراں میں ہے بزمِ میکہ
 میکشوں کی خاک سے کیا کیا خم و ساغر بنے
 کیا عجب اس خاکداں کے ہوں کبھی چشم و چراغ
 جا کے اوجِ آسمان پر جو مہ و اختر بنے
 بے گدازِ عشق رنگِ حسن بھی کھلتا نہیں
 عشق کے سانچے میں ڈھل کر نور کا پیکر بنے

دل کے ویرانہ میں کیا کیا حسرتیں آباد ہیں
 راہ میں سیلِ فنا کی کیسے کیسے گھر بنے
 اے شہِ کونین^۶! در پر غیر کے جھکتا نہیں
 تیرے سنگِ آستان کے واسطے جو سر بنے
 پھر بہار آئی چمن میں، پھر اُلٹا جوشِ جنوں
 پھر سر شوریدہ کی خاطر نئے پتھر بنے
 فصلِ گل ہے، باغباں! اب رخصتِ پرواز ہو
 اب تو تنکے آشیاں کے میرے بال و پر بنے
 بندۂ ناظر بھی حاضر تیرے میخواروں میں ہو
 اے شہِ لولاک^۷! جب تو ساقی کوثر بنے

یہ حقیقت کی منازل کا اگر رہبر بنے
 شاعر اپنے وقت کا، واللہ! پیغمبر بنے
 ترجمانِ نفسِ امارہ سخنِ داں گر بنے
 اس کا سب شعر و سخن شیطان کا دفتر بنے
 گرچہ ہے شاعر جہاں میں ایک جنس کس پر س
 کیا عجب گر تاجِ عزت کا یہی گوہر بنے
 المدد، اے تکیہ گاہِ امتاں! روحی فداک
 گوسفندوں کے ترے گرگِ کہن رہبر بنے
 اب سیاسی شاعری کے رہنما لیڈر ہوئے
 بلبلوں کی فوج کے کوئے کہاں افسر بنے
 جن کا دل پتھر بنے، جن کی زباں خنجر بنے
 ایسے بیدردوں سے اہل درد کی کیونکر بنے؟

چوروں میں جو پیدا ہوا ، چوروں میں پلا
چوری پہ وہ مجبور ہے ، مختار نہیں

خمخانہؑ ما غمزہ جانانہؑ ماست پیاں بہ خیالِ دوست پیاںؑ ماست
از عشوہ دختِ رز فریبے نغوریم اے ساقیؑ ما چشمِ تومیخانہؑ ماست

این شورِ جنوں مرا صدائے آموخت این دردِ دروں مرا دوائے آموخت
در باغِ جہاں جو عندلیبم ناظر این سبزہ و گل مرا نوائے آموخت

سودا بہ سرت چو نیست دیوانہ مباش
آن مے بہ خُمت چو نیست مستانہ مباش
آن جانِ تپاں اگر نہ داری بہ بدن
در آتشِ عشقِ شمعِ پروانہ مباش

در گردِ نہفتہ شہسوارے بینی در پردہٗ ہر نقش نگارے بینی
ز آئینہٗ دل زنگِ تغافل بردار تا جلوہٗ عکسِ رخِ یارے بینی

بلبلِ نالہ بہ دلِ فگارے آموخت گلِ خندہ لبی بہ گلِ غدارے آموخت
بے کارم و در خیالِ کارے ہردم عشقِ تومرا چہ کار و بارے آموخت!

جمعے ز زرو سیم گراں بارانند قومے زیں بارِ غم سبکسارانند
من تاجِ شہی بہ یک پیشیزے نخرم در لرزہ زیمِ جاں جہاندارانند

تھا وطن کی خاک سے شیخ و برہمن کا خمیر
 دشمن جانی پرانے، دوست یہ کیونکر بنے؟
 یوں تو بگڑی ایک دن بن جائے گی ان کی ضرور
 لیکن اس میں لطف کیا گر ٹھوکریں کھا کر بنے
 ناصحا! کیونکر بھلا دوں دل سے میں مہرِ بتاں
 جب خلیل و کعبہ سے پہلے بت و بتگر بنے؟
 پاسِ خاطر ہے ترا، اے محفلِ اربابِ ذوق!
 ورنہ ناظر اور نواسنجِ غمِ دلبر بنے؟

کس کی چشمِ مست یاد آتی رہی نیند آنکھوں سے مری جاتی رہی
 راہ میں کس شوخ کی بادِ صبا کل چمن میں بھول برساتی رہی
 دل تو شوقِ دید میں تڑپا کیا آنکھ ہی کم بخت شرماتی رہی
 روکتا ہے کوہِ جاناں سے مجھے عقل تیری، ناصحا! جاتی رہی
 عشق کی منزل میں عقل رہنا ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی رہی
 واہ رے دشتِ جنوں کی لذتیں ریگِ صحرا پاؤں سہلاتی رہی
 زلفِ مشکیں آنکھ سے پنہاں رہی گوشامِ جاں کو مہکاتی رہی
 کچھ نہ سمجھے خوشنوا یاں چمن عندلیبِ زار کیا گاتی رہی
 کان ہی بھرے تھے ورنہ غیب سے اک صداءِ دل نواز آتی رہی
 ہائے دنیا کی یہ زالِ سحر فتنہ شعبدے کیا کیا نہ دکھلاتی رہی
 قیصر و کسریٰ بھی تنہا چل دے کس کی یہ دنیا دوں ساتھی رہی
 کوہِ جاناں کا نہ کچھ پایا سراغ کو سفر میں جان تک جاتی رہی
 زندگی سے ہم رہے نا آشنا سانس گو آتی رہی، جاتی رہی

عمر بھر ناظر رہے صحرا نورد
بزمِ گلشنِ گرچہ یاد آتی رہی

دریں رہ ہم عنایتِ ہمرہانم برد ہر جا کہ خوابد کاروانم
نمی دانم نشانِ منزلِ دوست مگر محوِ سرودِ ساربانم
دریں منزل گہے بانگِ درانم گہے گرد و غبارِ کاروانم
زمین و آسمان جولانگہ من و خورشید و انجم ہمرہانم
دلِ پیکے ز درگاہِ جلالش وزو ہر دم پیامے ہر زبانم
بیادِ عارضِ تابندہ دوست چو حافظِ درسِ قرآن خوش بخوانم
من آن مرغم کہ از بانگِ سحرگاہ نوا آموزِ دشت و گلستانم
ز داغِ دلِ درونم لالہ زارِ یست یسا، بنگرِ بہارِ بوستانم
خزانم خوش تر از فصلِ بہاری قفسِ بہتر ز عیشِ آشیانم
دریں وادی من سرگشتہ ناظر
صداءِ بازگشتِ رفتگانم

یہی گر حسن کا عالم رہے گا تو زخمِ عشق بے مرہم رہے گا
نہ دے، اے ناصحِ مشفق! تسلی کہ جب تک ہم رہینگے، غم رہے گا
ہے جس کے دم سے یہ ہنگامہ عشق وہی ہر دم رہا، ہر دم رہے گا
بشریاں سیج پر پھولوں کی کبتک مثالِ قطرہٗ شبنم رہے گا
غمِ دل دینے والے! سیج بتانا تجھے بھی کچھ ہمارا غم رہے گا؟
نہالِ عشق کو شاداب کر لوں پھر ان آنکھوں میں کبتک نہ رہے گا
تمہاری یاد ہر دم تازہ ہوگی ہمارے دم میں جب تک دم رہے گا

دیارِ یار کا ملنا ہے مشکل جو یہ راہوں کا پیچ و خم رہے گا
 نشانِ باقی نہ ہوگا بزمِ جم کا مگر گردش میں جامِ جم رہے گا
 یہی پرواز ہے اس کی تو کب تک بنی آدم، بنی آدم رہے گا
 یہ بندی سے فرنگی کہہ رہا تھا کہ جب تک تم رہو گے، ہم رہے گا
 دمِ رخصت وہ کہتے تھے کہ ناظر
 ترے جانے کا ہم کو غم رہے گا

مثنوی ہیر و رانجھا

یہ نظم انجمن ارباب ذوق، لائل پور، کی تحریک سے
 تحریر ہوئی اور مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

دیکھ کر رسم و رہِ دورِ زمیں عاشقوں نے اک بنائی انجمن
 صدرِ مجلس حضرتِ اقبال تھے جو غمِ آفت سے مالا مال تھے
 سرگروہِ حلقہٴ احرارِ عشق منکشفِ جن پر ہوئے اسرارِ عشق
 عشق کا حضرت نے احیا کر دیا عشق کے گشتوں کو زندہ کر دیا
 کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی تازہ ہو جاتی ہے ہر دمِ زندگی
 ”ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ اند ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ اند“
 ہو گئے عاشقِ شریکِ انجمن آگئے سب چھوڑ کر گور و کفن
 بزم میں تھے قیس بھی، فرہاد بھی اور بہت سے عاشقِ ناشاد بھی
 جھنگ سے آکر ہوا رانجھا شریکِ عشق کی دنیا ہوئی گویا شریک
 عاشقوں کا یہ علم بردار تھا عشق کی بستی کا نمبردار تھا
 گرچہ اک مدت سے تھا یہ خواب میں زندہ اس سے عشق تھا پنجاب میں
 نکلا عاشق کا جلوس اس شان سے شہر والے رہ گئے حیران سے

آس کے سر پر پھول برسائے لگے اور گلے میں ہار پہنانے لگے
 ہر طرف تھی دھوم دھام اس طور کی جگمگا اٹھی فضا لاہور کی
 مال پر، سینا میں اور گلزار میں شہر کے کوچوں میں اور بازار میں
 حسن کے رمنوں کی آس نے سیر کی بتکدے کی اور کنشت و دیر کی
 تھا یہی سیر و تماشا چند روز عاشقوں کا شور و غوغا چند روز
 آخرش رانجھے کا جی آکتا گیا شہر سے صحرائیں گھبرا گیا
 صدرِ مجلس سے کہا اصرار سے

بندہ پرور مجھ کو رخصت کیجیے

ہنس کے فرمایا یہ سر اقبال نے صدرِ بزمِ اہلِ حال و قال نے
 کس لیے رانجھا میاں دلگیر ہے؟ کیا خیالِ پیرِ دامن گیر ہے؟
 شہر میں حوریں بھی ہیں، پیریں بھی ہیں کا کل پہچان کی زنجیریں بھی ہیں
 صبح راوی کے کنارے جائے عشق کے دریا میں غوطے کھائیے
 شام کو جا کر ٹہلیے مال پر دل کا سودا ہو کسی کی چال پر
 گر گزر ہو جانبِ لارنس باغ * شعلہ زن و ان حسن کے ہوں شب چراغ
 تم تو ٹھہرے سرسری لاہور میں حسن کی ہے فرسری لاہور میں
 جھنگ میں تیرے دھرا کچھ بھی نہیں جھاڑ جنگل کے سوا کچھ بھی نہیں
 ہر طرف لاہور میں گلزار ہے شہدرہ ہے اور شالہ مار ہے
 حسن کا اک میکدہ لاہور ہے عشق کے ساغر کا ہر دم دور ہے
 جا کے سینا اور تھیٹیئر دیکھیے آن میں ایکڑ ماہ پیکر دیکھیے
 وہ حسینوں کی ادائیں دلربا مہ جبینوں کی نوائیں جاں فزا
 وہ لبوں پر آن کے شیریں زمزمے عارضِ رخشاں وہ رنگیں قمقمے

* اس کا نام اب باغِ جناح ہے۔

حسن بھی ہے، راگ بھی اور رنگ بھی بزم میں مانی بھی ہے، ارژنگ بھی دور کر دل سے خیال ہیر کو اس جنوں کی توڑ دے زنجیر کو

کہنہ زنجیروں سے دل آزاد کر
عشق کی دنیا نئی آباد کر

عرض کی رانجھے نے، اے سلطانِ عشق! ہیر سے رانجھے کا ہے بیانِ عشق
میں خیالِ ہیر کیوں کر چھوڑ دوں؟ کس طرح پیاں ازل کا توڑ دوں؟
ہیر قسمت ہے مری تقدیر ہے وہ جبینِ عشق کی تحریر ہے
منزلِ جانانہ دکھلاتا ہے عشق راہ اور بے راہ لے جاتا ہے عشق
”رشتہ ای در گردنم افگندہ دوست مے بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست“
مہر و مہ میں بھی وہی تنویر ہے جس طرف دیکھا جالِ ہیر ہے
ہیر میرا دل ہے، میری جان ہے ہیر میرا دین ہے، ایمان ہے
نورِ شمع لایزالِ ہیر ہے مظہرِ شائبِ جالی ہیر ہے
ہیر کا جلوہ حسینوں میں نہیں وہ چمک زہرہ جبینوں میں نہیں
آب و رنگِ حسنِ جعلی اور ہے ہیر کے ہونٹوں کی لالی اور ہے
آس کو رنگ آمیزیوں سے عار ہے ہیر فطرت کا گلِ گلزار ہے
گرچہ غازہ زینتِ رخسار ہے آئینے کا حسن کے زنگار ہے
شاہدِ شہری ہے مشیتِ استخوان ہیر کی رگ رگ میں موجِ بخون دواں
آس کے چہرے پر ہے رنگِ زعفران اس کے عارض پر ہے حسنِ ارغواں
ہیر کے گیسو وہ بل کھاتے ہوئے دوش پر ہیں سائب لہراتے ہوئے
آس کی آنکھوں میں چمک ہے نور کی آس کے ماتھے پر تجلی طور کی
آس کو شوقِ محفلِ آرائی نہیں وہ کوئی معشوق ہرجائی نہیں
ہیر سنا کی چمک سے دور ہے اسلئے آنکھوں میں آس کی نور ہے

آس کو چٹخارا کوئی بھاتا نہیں اسلئے دانتوں کو گھن کھاتا نہیں
 تندرستی کی وہ اک تصویر ہے دودھ مکھن کی وہ اک تعمیر ہے
 آس کو آزارِ شکم ہوتا نہیں آس کو کچھ ٹی بی کا غم ہوتا نہیں
 آس کو فیشن کی نہیں لاچاریاں اور نہ بیکاری کی ہیں بیماریاں
 محو افسانوں میں وہ ہوتی نہیں ناولوں کو پڑھ کے وہ روتی نہیں
 ہیر ہے وہ خوشنما اک بن کا پھول جسکے منہ کو چوم لے گلشن کا پھول
 دیوی دریا کی وہ، بن کی مورتی سرو و شمشادِ چمن کی مورتی
 وہ خرامِ نازِ جنگلِ بار* میں جس طرح آہو پھریں قاتار میں
 ہائے وہ پھولوں کا بن میں پھولنا ہیر کا جنگل میں جھولا جھولنا
 اک طرف چیناب** کی موجیں رواں اک طرف ساحل پہ وہ سرو رواں
 آس کا خوابِ ناز وہ دریا کنار جھوم کر لہروں کا وہ گانا ملار

ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی وہ رات کی

میٹھی میٹھی بنسری برسات کی

ہائے! یاد آئی وہ پیاری بنسری ہمدردِ بادِ بہاری بنسری
 وہ نیستان کی کہاری بنسری وہ بیابان کی دلاری بنسری
 ہائے! وہ میری رنگیلی بنسری وہ مری میٹھی سریلی بنسری
 وجد میں آس سے ستارے رات کے مست و بیخود چاند تارے رات کے
 محو جب تانوں میں آس کے ہو گئے گھونسلوں میں بن کے پنچھی سو گئے

* بار پنجابی لفظ ہے مگر جنگل بار کا لفظ رانجھا کے نام کے ساتھ
 اس طرح منسوب و مشہور ہو گیا ہے کہ رانجھا کی زبان سے اس کا
 استعمال محل اعتراض نہیں ہو سکتا۔

** دریاۓ چناب۔

چاند بھی نغموں میں آسکے کھو گیا چاندنی کا کھیت بن میں ہو گیا
 بنسری رانجھے کا سوز و ساز ہے کشتگانِ عشق کی آواز ہے
 دل نوازِ درد کیشان بنسری چارہ سازِ سینہ ریشاں بنسری
 از نیستانم چو نے بیریدہ اند ”از فقیرم مرد و زن نالیدہ اند“

پھر وہ دن، اے کاتبِ تقدیر! ہو

وہ نیستان ہو، وہ نے ہو، ہیر ہو

رباعیات

اے خالقِ انس و جان! جہاں ہے تیرا
 تیری ہے زمیں، یہ آسمان ہے تیرا
 ہے عرش سے فرش تک ترا نور و ظہور
 ہرچند کہ لامکان، مکان ہے تیرا

اس گل میں ہے رنگِ گلستانی کیا کیا!
 ہے خاک میں آبِ زندگانی کیا کیا!
 انسان کی نظر ہی سطحِ یں ہے ورنہ
 ہر شے میں ہیں اسرارِ نہانی کیا کیا!

مضمیر ہے تغیر میں بقاء ہستی ہے رد و بدل سے ارتقاء ہستی
 ملبوس بہار کیوں آتارے نہ خزاں فطرت کو بدلتی ہے قباء ہستی

وہ شعر و غزل کا اب زمانہ نہ رہا وہ مطربِ عشق کا ترانہ نہ رہا
بدلی ہے فضاء دشت و صحرا ہمدم وہ نجد میں قیس کا فسانہ نہ رہا

یہ اہل سخن کا جوشِ مستی دیکھو یہ نشہٴ بادۂ الستی دیکھو
فرضی نشہ ہے اور خیالی مستی شاعر کا یہ شوقِ مے پرستی دیکھو

زر دار کی یہ ہوس پرستی کب تک؟ بے زہد عذابِ فاقہ مستی کب تک؟
تہذیبِ فرنگ کا یہ تحفہ تاکے؟ یہ لعنتِ کارزارِ ہستی کب تک؟

اس نیشترِ غم سے اماں میں رہتے خوشوقت فضاء لامکاں میں رہتے
بے مہر زمیں ہے، آسماں ہے ظالم ہم کاش کسی اور جہاں میں رہتے

ہم رازِ حیاتِ فاش کرنے کے نہیں
دمِ کشف و کرامات کا بھرنے کے نہیں
یہ شک ہے کہ کس شکل میں جینا ہوگا
لیکن ہے یقین ہمیں کہ مرنے کے نہیں

منعم کو پلاؤ زردہ کھاتے دیکھا اور دردِ شکم سے تلملاتے دیکھا
مفلس سو باتھا کھا کر اک نانِ جویں اور صبحِ گجر دم اسے گاتے دیکھا

قیدِ ہستی میں کوئی جان دار نہیں
اسباب و علل میں جو گرفتار نہیں

چوروں میں جو پیدا ہوا ، چوروں میں ہلا
چوری پہ وہ مجبور ہے ، مختار نہیں

خمخانہؑ ما غمزہ جانانہؑ ماست یہاں بہ خیالِ دوست پہانہؑ ماست
از عشوہ دختِ رز فریبے خوریم اے ساقیؑ ماچشمِ تو میخانہؑ ماست

این شورِ جنوں مرا صدائے آموخت این دردِ دروں مرا دوائے آموخت
در باغِ جہاں جو عندلیبم ناظر این سبزہ و گل مرا نوائے آموخت

سودا بہ سرت چو نیست دیوانہ مباح
آن مے بہ خمت چو نیست مستانہ مباح
آن جانِ تپاں اگر نہ داری بہ بدن
در آتشِ عشقِ شمع ہروانہ مباح

در گرد نہفتہ شہسوارے بینی در پردہ ہر نقش نگارے بینی
ز آئینہؑ دل زنگِ تغافل بردار تا جلوہٗ عکسِ رخِ یارے بینی

بلبل نالہ بہ دل فگارے آموخت گل خندہ لبی بہ گلِ عذارے آموخت
بے کارم و در خیالِ کارے ہردم عشقِ تو مرا چہ کار و بارے آموخت!

جمعے ز زرو سیم گرانبارانند قومے زین بارِ غم سبکسارانند
من تاجِ شہی بہ یک پشیزے فخرم در لرزہ ز بیمِ جاں جہاندارانند

سید قوم کا مثیل ، کعبہ میں ہے نیا خلیل
 مستند پیر پر جوان ، تازہ بتازہ ، نو بنو
 لائے نسیم صبح اگر بزم حبیب کی خبر
 ناظر پیر ہو جوان ، تازہ بتازہ ، نو بنو
 یہ گل و گلستان رہے ، نعمت بلبلاں رہے
 حسن چمن ہو جاوداں ، تازہ بتازہ ، نو بنو

خیر مقدم

جناب شمس العلماء مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی
 باز ہنگام گل و سرو و سمن آید ہمے
 بلبل گم گشتہ در بزم چمن آید ہمے
 زینتِ این بزم و زیبِ انجمن آید ہمے
 آن ادیب و شاعر شیریں سخن آید ہمے
 آگئے ہیں سیرِ روم و شام و مصر و زنگ سے
 آشیاں بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
 ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دئے
 تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دئے
 پنجہ احباب سے دامن چھڑا کر چل دئے
 ایک شعر دلنشین ہم کو سنا کر چل دئے
 رختِ خود بر موجِ دریا چوں حبابِ انداختیم
 ”ہرچہ بادا باد، ما کشتی در آب انداختیم“

presented by asim khan

9

PART 2

ہندوستان کا قومی ترانہ

یہ نظم لاہور کی آل انڈیا نمائش کے مشاعرے میں ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو پڑھی گئی تھی۔ حضرات سامعین پر اس سادہ سی نظم کا اس قدر اثر ہوا کہ اس کے خاتمے تک تحسین اور تالیوں کی متصل بارش ہوتی رہی اور سر عبدالقادر، صدر مشاعرہ، نے بھی اس نظم کو اس عظیم الشان مشاعرے کی ”پائدار یادگار“ قرار دیا۔ ان اشعار میں شاعرانہ بلند پروازی اور صنعت گری کا کوئی مظاہرہ نہ تھا، مگر تعلیم یافتہ طبقے میں حالات حاضرہ نے حب وطن کا جو ولولہ پیدا کر دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ نظم ”سرود بہ مستان یاد دہانیدن“ کا کام دے گئی۔ اس وقت ”نغمہ فردوس“ حصہ دوم کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ مگر مولانا کمال نے ضروری سمجھا کہ کتاب کے شروع میں اس نظم کا اضافہ کر دیا جائے اور کتاب کی سابقہ ترتیب بدستور رہے۔ میرے خیال میں بھی اس ”قومی ترانہ“ سے کتاب کا آغاز ہونا ایک مبارک فال ہے۔

ہائے! میرا جان سے پیارا وطن
یہ مرا ہندوستان، جنت نشان
وہ بہالے پسر شعاعِ مہر سے
کوئلوں اور قمریوں کا نغمہ زار
مشرقی تہذیب کا چشم و چراغ
اولیاؤں اور اوتاروں کا گھر
کیسے کیسے اس سے اٹھے شوریں
اپنے بیگانوں کا اٹھکرایا ہوا
ہائے! میری آنکھ کا تارا وطن
یہ مرا فردوسِ نظارا وطن
صبح دم جلووں کا قوارا وطن
سرو و سنبل کا چمن آرا وطن
ایشیا کا دل، جگر پارا وطن
عشق اور عرفاں کا گہوارا وطن
کتنے میدان جیت کر بارا وطن
پھوٹ کا اور لوٹ کا مارا وطن

چارہ گر جس کے غلاموں کے غلام وائے! بے چاروں کا بے چارا وطن
مشرق و مغرب کی روزی کا کفیل
بھوک اور افلاس کا مارا وطن

مسجد اور مندر میں ہے پیکار کیوں؟ یہ نزاعِ سُبْحہ و زَنّار کیوں؟
ہمنوا، ہمدم تھے ناقوس و اذان ان میں اب چلنے لگی تلوار کیوں؟
ان بتوں کی بھی خدائی تھی کبھی بندگی سے ہونہ ان کو عار کیوں؟
اب جو کعبہ ہے کبھی بتخانہ تھا ہیں بتوں سے شیخ جی بیزار کیوں؟
اے گرو کے لال! اے گیسو دراز! ہوں یہ برہم گیسو خمدار کیوں؟
وہ موجد اور وحدت کیش تو تیری مسلم سے رہے تکرار کیوں؟
لیڈروں کا کیوں یہ غوغا ہر طرف ابلہوں پر چھا گئے عیار کیوں؟
یہ جلوسوں کے جنازے کس لیے؟ یہ تماشا بر سر بازار کیوں؟
ملک میں ان بن کا یہ پرچار کیوں؟ یہ وطن پر پھوٹ کی پھسکار کیوں؟
کیوں غنی محتاج سے کھچتا رہے؟
دامنِ گل سے نہ لپٹے خار کیوں؟

اب بتوں سے لو لگانا چاہیے ان کی الفت آزمانا چاہیے
عید پنڈت کو منانا چاہیے شیخ کو ہولی کھلانا چاہیے
اور یہ دونوں بگڑ بیٹھیں اگر ان کو گنگا میں گرانا چاہیے
جن کی لو سے بزم میں لگ جائے آگ ایسی شمعوں کو بجھانا چاہیے
مدتوں مسلم یہاں مہاں رہا اب تو اس کو گھر بسانا چاہیے
گائے تو مالک ہے سب گھر باریکی اونٹ کو بھی کچھ ٹھکانا چاہیے
اب تو بھارت دیش کے زیرِ علم ترکی و تازی کو لانا چاہیے
گو بہت ہوں راستوں کے بیر پھیر سب کو اک منزل پہ لانا چاہیے

خود زباں سے بھی زباں مل جائے گی پہلے دل سے دل ملانا چاہیے
 ہیں وطن کے سورما یہ نوجواں ان کو اب میدان میں آنا چاہیے
 گلشنِ آفت میں یہ پھولیں پھلیں بریم رس ان کو پلانا چاہیے
 ایک دن بچھڑے ہوئے مل جائیں گے قوم بننے کو زمانا چاہیے
 ہم کو ناظر! بزمِ گلشن کے لیے
 یہ ترا رنگیں ترانا چاہیے

یارانِ نجد

جوبلی

بتقریب جلسہ "جوبلی" مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

عزیزو! کاروانِ قوم کے اب راہبر تم ہو
 تمناؤں کے گلشن، آرزوؤں کے ثمر تم ہو
 ابھی خوابِ گراں سے آنکھ کچھ مسلم نے کھولی ہے
 شبِ غفلت کی خاموشی میں گلابِ سحر تم ہو
 پہنچنا منزلِ مقصود تک ہرگز نہیں مشکل
 جو میدانِ طلب میں ہمقدم با ہمدگر تم ہو
 محبتِ قوم کی کچھ کم نہیں اغیار سے تم میں
 مگر اک جذبِ مرکز کے اثر سے بے خبر تم ہو
 برنگِ موجِ دریا مل رہی ہیں ملتیں باہم
 مگر ریگِ بیاباں کی طرح سب منتشر تم ہو

قدا مت آچکی ہے زد میں طوفانِ تمدن کی

مگر اِس سہمگیں سیلِ بلا سے بے خبر تم ہو

آدھر تجدید کا غوغا، آدھر تقلید کا سودا

آدھر ہے برقِ خاطف اور آدھر شمعِ سحر تم ہو

عمل پیرا حریفوں نے زمین پر کر لیا قبضہ

تخیل کے پروں سے آسمان پر رہ سپر تم ہو

کہیں شورِ غزل خوانی، کہیں زورِ زباں دانی

غرض ہر شغلِ لا یعنی کے شائق بیشتر تم ہو :

بڑے عالم، بڑے فاضل، بڑے شاعر، بڑے کامل

مگر بازارِ عالم میں متاعِ کس مخر تم ہو

آدھر بامِ فلک پر غیر کا آڑتا ہے طیارہ

آدھر یک دانہ خال و مرغِ دل کے نوحہ گر تم ہو

بجز تعلیم کے ڈھونڈو اگر راہیں ترقی کی

تو قصرِ قوم کی بنیاد رکھتے ریت پر تم ہو

مسلمانو! یہ دارالعلم کوئی دن کا مہماں ہے

نہ باہم منسلک تنظیم کے رشتے سے گر تم ہو

وہ نقشہ بزمِ جم کا، ہم نشینو! جم نہیں سکتا

نہ جب تک لے کے سب جامِ گدائی در بدر تم ہو

پیامِ استادِ حالی کا زبانِ چرخِ گرداں سے

سناتا ہوں کہ پسندِ پیر سے کچھ بہرہ ور تم ہو

”زمانہ نام ہے میرا تو میں تم کو بتا دوں گا

کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے، نام اُن کا مٹا دوں گا“

یہ بزمِ قوم میں کب تک بساطِ پاستان ہوگا؟
 خیالِ حال و استقبال کب خاطرِ نشان ہوگا؟
 یہ جلسے شعر خوانی کے ، یہ دنگل پہلوانی کے
 مسلمانو! وہی کعبہ میں پھر عشقِ بتاں ہوگا؟
 ضرورت آج ہے صنعت کی ، طبعی کی ، ریاضی کی
 کہیں ایہام کی صنعت سے فکرِ آب و تاب ہوگا؟
 خبر لو ، ہمدمو! دارالعلوم قوم کی مل کر
 اسی چشمہ سے ہر سو فیض کا دریا رواں ہوگا
 یہ دارالعلم جسمِ قوم میں مانندِ جاں ہوگا
 یہ دل ہوگا کہ جس سے خونِ رگ رگ میں رواں ہوگا
 جو اس مرکز سے ہٹ کر اور محور پر دواں ہوگا
 شہاب آسا وہ جل بھٹ کر غبارِ آسماں ہوگا
 بنامِ پاکِ احمدؑ ، یہ مدینہِ علم کا ہوگا
 ”علی بابا“ کا در پہ اک مہر و نشان ہوگا
 پیامِ زندگی ہوگی فضا اس باغِ ملت کی
 دمِ عیسیٰ ہوا دارِ نسیمِ بوستان ہوگا
 تنِ بے جاں میں ملت کے جو روحِ علم پھونکے گا
 وہ مہدی وقت کا ہوگا ، مسیحا زمانِ ہوگا
 اگر پیر و جوان مل کر کمرِ ہمت کی باندھیں گے
 تو یہ پنجاہ سالہ پیر پھر رعنا جوان ہوگا
 مٹا گر یہ حصارِ عافیت تیرے تغافل سے
 تو اے خیرالامہ! یہ تیری تربت کا نشان ہوگا

اٹھے گی آہِ عالم سوزِ اک سید کی تربت سے
 کہ جس کا مطلعِ اسلام پر ہر سو دھواں ہوگا
 مگر اللہ والوں کا خدا خود میرِ سامان ہے
 وہی اس باغِ وحدت کا ہمیشہ باغبان ہوگا
 مجھے ناظرِ کوئی دن اور اس محفل میں رہنے دو
 فضاءِ نجد میں پھر قیس بوڑھا نوجوان ہوگا
 پیامِ بزمِ گلشن، اے نسیمِ صبح! تو لے چل
 یہ نکہت کو بکو پھیلا، یہ ہر سو رنگ و بو لے چل

سالانہ اجلاس

کشمیر اور لداخ سے اولڈ ہوائز ایسوسی ایشن، مسلم یونیورسٹی، کے
 سالانہ جلسہ میں شامل ہونا ممکن نہ تھا۔ لہذا یہ مکتوبِ منظوم
 سکرٹری صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا اور یارِ منزل میں پڑھا گیا۔

ایسا، پیکِ نسیمِ روح پرور! کہ ہے دشت و چمن تجھ سے معطر
 بہارِ گلشن و کہسار تجھ سے فضاءِ دشتِ عنبرِ بارِ تجھ سے
 پیامِ عاشقِ مہجور تو ہے انیسِ خاطرِ رنجور تو ہے
 ترا پورب کی جانب گر گزر ہو جو کوئل کی طرف تو رہ سپر ہو
 تو واں اک گلشنِ جنتِ نشاں ہے عجب جنگل میں منگل کا سہاں ہے
 فضا اُس کی اِرم سے دلکشا تر حریمِ اُس کا حرم سے جاں فزا تر
 سرِ رہ وہ درختوں کی قطاریں چمن میں سبزہ و گل کی بہاریں
 عجب دلکش ہے اُس کا بابِ عالی ہے جس کی وضعِ دنیا سے نرالی

وہ تصویرِ بلال و غلّی خرما
وہ آس کے دلربا قصر و منازل
ادھر مسجد کی سقف گنبدی ہے
ادھر مرکز میں ہے اک قصر رعنا
وہ سر سالار کا ”سالار منزل“
عجب دلکش ہے وہ کاشانہ امشب
اسی منزل میں اپنا کارواں تھا
دلِ غمدیدہ میں نقشہ ہے آس کا
وہیں ہیں محرم اسرار میرے
جہاں کے پھول اس گزار میں ہیں
ہے باغِ قوم کی بو باس آن سے
وہ ہیں چرخِ تمنا کے ستارے
دلِ مہجور کی ہے آن سے ہستی
تصور میں مرے وہ انجمن ہے
الہی! خیر ہو اس قافلے کی
یہیں مسجد کے گوشے میں نہاں ہے
فضا میں روح آس کی بس رہی ہے
فنا کی نیند میں گو سو رہا ہے
صبا گزرے اگر تو اس چمن سے

حجازی شان ہے جس سے ہویدا
کہ جن کو دیکھ کر وارفتہ ہو دل
صدا تکبیر کی واں گونجتی ہے
کہ ہے وہ قصر حمرا کا مٹنا
جسے زیبا ہے کہنا ”یار منزل“
وہی ہے منزلِ جانانہ امشب
اسی گلشن میں اپنا آشیان تھا
سرِ شوریدہ میں سودا ہے آس کا
وہیں دلبر ہیں اور دلدار میرے
ہزاروں یوسف اس بازار میں ہیں
نراسوں کی بندھی ہے آس آن سے
وہ ہیں کاخِ شکستہ کے سہارے
یہ ویرانہ ہے آن کے دم سے بستی
کہ جس کا صدرِ مجلس ماریسن ہے
ہے جس کا کارواں سالار مہدی
وہ سید نام جس کا حرزِ جاں ہے
صدا آس کی ہوا میں گونجتی ہے
وہ تخمِ زندگانی بو رہا ہے
تو کرنا عرض یہ سرو و سمن سے

تمہاری یاد سے ہے زندگانی
ہے باقی عشق، گو دنیا ہے فانی

سالانہ اجلاس

یہ نظم میاں محمد امین مرحوم ، ریٹائرڈ ڈی . ایس . پی . پولیس وریس جالندھر کے ایما سے لکھی گئی . آپ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ، مسلم یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں ہمعصر اولڈ بوائز کے ساتھ مل کر عہد طالب علمی کا ترانہ گانا چاہتے تھے جو میرے شریک جلسہ نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی رہا .

بزمِ چمن ہے گل فشاں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
لالہ و گل کا ہے سہاں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
بلبلِ نغمہ خواں بگو ، مطربِ گلستان بگو
فصلِ چمن کی داستان ، تازہ بتازہ ، نو بنو
پیکِ صبا بہار میں ، جائے جو کوءِ یار میں
جذبہٴ دل کا ہو بیاں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
آنکھوں کا نور ہے وہی ، جلوۂ طور ہے وہی
آس کی ہیں لن ترائیاں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
بزم کا رنگ و بو وہی ، ساغرِ مشک بو وہی
گردشِ جامِ ارغوان ، تازہ بتازہ ، نو بنو
نغمہٴ سارباں وہی ، نجد کی وادیاں وہی
قیس کا کارواں رواں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
سیدہ اگرچہ سو گیا ، عشق کا بیج بو گیا
ہے یہ حیاتِ جاوداں ، تازہ بتازہ ، نو بنو
رقص وہی ہوا میں ہے ، وجد وہی فضا میں ہے
روحِ رگوں میں ہے دواں ، تازہ بتازہ ، نو بنو

منعِ مے کا صبح گر کہنا ہو وعظِ شام سے ہوتے ہیں مے آشام ہم
 دل میں پاتے ہیں بتوں کی آرزو منہ سے جیتے ہیں خدا کا نام ہم
 کہتے ہیں سجادۂ تقوا اسے جب بچھاتے ہیں غرض کا دام ہم
 نفسِ غالب ہو جو حبِ قوم پر کیوں نہ ہوں ہر کام میں ناکام ہم
 مل رہی ہیں ملتیں آفاق میں پر کھنچے جاتے ہیں صبح و شام ہم
 اب وہ نذرِ فرقہ بندی ہو گیا
 لائے تھے وحدت کا جو پیغام ہم

کس قدر بے ساز و ساماں ہو گئے کیا تھے اور کیا ہم مسلمان ہو گئے
 کیسے کیسے صاحبِ نام و نشان کنجِ گم نامی میں پنہاں ہو گئے
 جن سروں پر تھا کبھی بالِ ہما آج غیروں کے مگسراں ہو گئے
 اہل ہمت، اہل دولت، اہل دین رونقِ شہرِ خموشاں ہو گئے
 جاءِ عبرت اہل دوراں کے لیے آن کے قصرو کاخ و ایوان ہو گئے
 ہے ترقی پر مرضِ ادبار کا دین و دنیا صرفِ دریاں ہو گئے
 اک مرض کی گر کوئی تدبیر کی دوسری علت کے ساماں ہو گئے
 اب نہیں دنیا سے اہل دین نفور رہنِ دنیا دین و ایمان ہو گئے
 ہے وہی اسراف کی لت قوم کو گرچہ خالی جیب و داماں ہو گئے
 صدقِ عزم و صدقِ دل، صدقِ مقال پائمالِ کذب و بہتان ہو گئے
 رہناؤں کا نہیں اگلا سا قحط اب تو لیڈرِ سخت ارزاں ہو گئے
 رہ گئیں دل ہی میں دل کی حسرتیں جو ارادے تھے وہ ارماں ہو گئے
 تہنیت کا بزم میں دیکھا نہ رنگ لاجرم ہم مرثیہ خواں ہو گئے
 آئے ناظرِ سیر کو وقتِ خزاں
 جب گل و گزار ویراں ہو گئے

یہاں قوم کے باغباں آ کے دیکھیں
 مکیں آ کے دیکھیں، مکاں آ کے دیکھیں
 اخوت کا دیکھیں یہ سرچشمہ جاری
 یتیموں کے اور بیکسوں کے سروں پر
 یہ تبلیغ و تنظیم و اسکول و کالج
 ہوا یاس سے جن کا تاریک منظر
 وہ پیکار ہستی میں سرگرم جولان
 ہے یاں موج زن ایک دریا عمل کا
 یہ دین اور دنیا کا بارِ امانت
 ہوا زندہ دل نام پنجاب جن سے
 نگاہیں ترستی ہیں جن صورتوں کو
 وہ اعیان پنجاب کی انجمن میں
 شریعت کے دیکھیں وہ تابندہ اختر
 ادھر دیکھیں دستِ کرم کا نظارہ
 پس پردہ بہنوں کو اور بیٹیوں کو
 قمارِ محبت میں جاں تک لگا دیں
 وہ ناظر کہ اک پیرِ خلوت نشین ہے
 اسے انجمن میں جوان آ کے دیکھیں

مردِ افلاک

بتقریب جلسہ* انجمن بصدارت شمس العلام مولانا مولوی
نذیر احمد صاحب دہلوی

مقامِ عبرت ہے دورِ گردوں ، ذرا بصیرت کی آنکھ وا کر
فلک کے پردوں میں ساز کیا ہے ، کبھی تو یہ راگنی سنا کر
ہے کیسا یہ انقلاب جاری ، زماں میں سائر ، مکاں میں ساری
رہا سدا شش جہت میں طاری ، یہ آسمان و زمیں پہ چھا کر
کہیں بلندی ، کہیں ہے پستی ، یہی ہے رمزِ مصافِ ہستی
اسے ابھارا اسے دبا کر ، اسے جگایا اسے سلا کر
جبل میں ، دریامیں ، گلستان میں ، ملخ میں ، ماہی میں ، انس و جان میں
سدا قوی اور ناتواں میں رہا تنازع جہاں میں آ کر
ہے مصر کا گہ دور دوراں ، ہے گاہ یونان کا قرہ و شان
کبھی ہے ایران ، کبھی ہے توران ، گئے یہ سب نوبتیں بجا کر
کل ایشیا کی تھی کامرانی ، ہے آج یورپ کی لن ترانی
غرض یونہی دورِ آسانی بگاڑتا ہے بنا بنا کر
خدا کی عادت رہی سدا "لَا يَغَيِّرُ اللَّهُ مَا بَقُومُ"
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں ، عمل کی پاداش اپنے پا کر
یہ بحرِ مواج کے تھپیڑے ، ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے
ہیں پہنچے ساحل پہ اہل ہمت ، طلب کے چپو چلا چلا کر
کئے جوانوں نے دشت رنگیں ، لیے ہزاروں حصار سنگیں
لہو کے دریا بہا بہا کر ، سروں کی بھینٹیں چڑھا چڑھا کر

جب جہاز آن کا بہنور میں ٹھو کریں کھاتا رہا
 مولوی صاحب کا دل کچھ روز متلاتا رہا
 ہر طرف اک قلمِ مَوَاجِ غراتا رہا
 ایک طوفانِ بلا ہر سمت منڈلاتا رہا
 دل پہ حضرت کے نہ تھا طوفان کا کچھ خوف و خطر
 مطمئن بیٹھے توکل کا تھے لنگر ڈال کر

ہند کا کوئی جہاز اک دن بہنور میں آ گیا
 یہ خبر سن کر یہاں چھوٹا بڑا تھرا گیا
 حضرت سید کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
 اتنے میں لیکن عدن سے آپ کا تار آ گیا
 چیسٹ باک از صولتِ امواج و آشوبِ ہوا
 اندراں کشتی کہ دروے ناخدا باشد خدا

آسمان سر پر نیا تھا اور نئی نیچے زمیں
 فرشِ خاکی کی جگہ قلم کی موجِ سہمگیں
 بحرِ طوفان خیز کی موجیں تھیں ہیبت آفریں
 ایک مسٹر آرٹلڈ ان کے تھے ہمدرد، ہمنشین
 حادثاتِ دہر کا دل میں نہ کچھ وسواس تھا
 تھا خدا شبلی کے سر پر اور ”فرشتہ“ پاس تھا

ذاتِ والا پر ہمیں شبلی کی فخر و ناز ہے
 علم و حکمت میں بلند ان کی بہت پرواز ہے
 آپ کا شعر و سخن الہام ہے، اعجاز ہے
 نام سے حضرت کے تاریخ و ادب ممتاز ہے

آپ نے تہذیبِ اسلامی کا احیا کر دیا
قوم کے اک شہرِ خاموشاں کو گویا کر دیا

و ر و د مسعود

تواب مسعود جنگِ بہادر ڈاکٹر سرسید راس مسعود مرحوم کی
سیاحت کشمیر کے دوران میں اور ان کی روانگی ولایت سے پہلے
یہ نظم انجمن مفرح القلوب کے ایک اجلاس میں پڑھی گئی۔

تھیں جس کی رہ پر آنکھیں بہاری کالج سے پہنچی اک چار یاری
سیرت کی دلکش، صورت کی پیاری اس کی ادائیں جانانہ ساری
کشمیر پہنچے یہ چپ چپاتے صیاد دل کے، جاں کے شکاری
سبزہ نے فرشِ مخمل بچھایا گدستہ لاف باہ بہاری
ہیں آبشاریں گاتی ملاریں نہروں کے لب پر منت گزاری
شمشاد رہ میں ان کے سلامی جھلتی ہے پنکھا شاخ چناری
گرو چمن کے سب گل بداماں ڈل کر رہی ہے آئینہ داری
کہتی ہے سوسن اپنی زباں میں میں تم پہ صدقے، میں تم پہ واری
مرغانِ گلشن گاتے ہیں پیہم

تم آؤ نت نت، تم آؤ جم جم

اس انجمن میں، یارانِ جانی! اک میرے ہادی کی ہے نشانی
وہ آس چمن کی ہے سبز ڈالی تھا جس کا والی ملت کا مالی
ہے روحِ سید آس کے بدن میں ہے بوءِ یوسف! اس پیرہن میں
ہے یہ سعادت مسعود تجھ میں احمد ہے تجھ میں، محمود تجھ میں

ہے نور سید تیری جبین میں اس گل کی بو ہے اس انگلیں میں
 سید کا نقشہ ، سید کی خوبو سید کی آنکھیں ، سید کے ابرو
 سید کا لہجہ ہے ہر سخن میں پردہ نیا ہے ساز کہن میں
 مسعود پیارے! تجھ کو خدا دے اعلیٰ آمنگیں ، اونچے ارادے
 ہو تجھ کو حاصل وہ ارجمندی پستی کو تیری چومے بلندی
 اسلامیوں کی آنکھوں کے تارے دل کے نکالو ارماں ہمارے
 ہے شمع محفل تو بزم جاں کی ہے آنکھ تجھ پر ہندوستان کی
 باغ جہاں میں پھولے پھلے تو دادا کی اپنے رہ پر چلے تو
 طرح جدائی اب تم نے ڈالی
 اللہ حافظ! اللہ والی!

اخوان الصفا

یونین کلب محمدن کالج، علیگڑھ کے سالانہ جلسہ میں یہ میری پہلی
 نظم تھی۔ اس ماحول کا یہ پرانا مرقع غالباً اولڈ بوائز اور برادران
 جدید کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ نظر ثانی میں کہیں کہیں لفظی
 ترمیم کی گئی ہے۔

آج پھر رشکِ چمن ہے یونین دیدنی ہے فصلِ گل کا بانکپن
 بام و در پر سبزہ و گل کی بہار جھینپتی ہے جس سے دیوارِ چمن
 دیکھ کر تیغِ ہلالی کا نشان یاد آیا قوم کا عہدِ کہن
 یونین میں مہبرانِ یونین یا ختن میں ہیں غزالانِ ختن
 سب کے سینوں میں اخوت کی خلش سب کے دل میں دردِ ملت کی چہن

ہے نور سید تیری جبین میں آس گل کی بو ہے اس انگبین میں
سید کا نقشہ ، سید کی خوبو سید کی آنکھیں ، سید کے ابرو
سید کا لہجہ ہے ہر سخن میں پردہ نیا ہے ساز کہن میں
مسعود پیارے! تجھ کو خدا دے اعلیٰ آمنگیں ، اونچے ارادے
ہو تجھ کو حاصل وہ ارجمندی پستی کو تیری چومے بلندی
اسلامیوں کی آنکھوں کے تارے دل کے نکالو ارماں ہمارے
ہے شمع محفل تو بزمِ جاں کی ہے آنکھ تجھ پر ہندوستان کی
باغِ جہاں میں پھولے پھلے تو دادا کی اپنے رہ پر چلے تو

طرح جدائی اب تم نے ڈالی
اللہ حافظ! اللہ والی!

اخوان الصفا

یونین کلب محمدن کالج، علیگڑھ کے سالانہ جلسہ میں یہ میری پہلی
نظم تھی۔ اس ماحول کا یہ پرانا مرقع غالباً اولڈ بوائز اور برادران
جلید کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ نظر ثانی میں کہیں کہیں لفظی
ترمیم کی گئی ہے۔

آج پھر رشکِ چمن ہے یونین دیدنی ہے فصلِ گل کا بانکپن
بام و در پر سبزہ و گل کی بہار جھینپتی ہے جس سے دیوارِ چمن
دیکھ کر تیغِ ہلالی کا نشان یاد آیا قوم کا عہدِ کہن
یونین میں ممبرانِ یونین یا ختن میں ہیں غزالانِ ختن
سب کے سینوں میں اخوت کی خلش سب کے دل میں دردِ ملت کی چبھن

یونین کی چار دیواری میں ہیں
 کیوں زمانے میں نہ ہو اس کا وقار
 اپنے شاگردوں کا محبوب القلوب
 جلوہ فرما اک طرف ہے آرنلڈ
 آفتِ اسلام اس کے دل میں ہے
 سب عزیزوں میں ہوا ہر دل عزیز
 صبحدم ہے ہال میں رنگیں نوا
 اک طرف وہ بلبلی بستانِ قوم
 عمدة السادات، زین العابدین
 اک طرف وہ شاہِ بے تاج و سریر
 نوجوانوں میں ہے اک پیرِ کہن

ہر زباں پر جس کا پیارا نام ہے
 جس کی شیدا ملتِ اسلام ہے

دیکھ جائیں نکتہ چیں آ کر ذرا
 رشک ہے اس خاک پر اکسیر کو
 اس دبستان کا ہے یہ پہلا سبق
 خود خدا آباد کرتا ہے وہ گھر
 گرم جولاں ہیں طلب میں رات دن
 ہر سحر سنتے ہیں آوازِ سروش
 گونجتی پھرتی ہے قصر و کاخ میں
 ہے ہر اک آواز گلبانگِ رحیل
 جلد وہ دن ہو کہ بزمِ قوم کو
 ہے سمندر میں آمیدوں کا جہاز
 زندہ باش، اے سیدِ عالی مقام !
 کیا اثر رکھتی ہے کالج کی فضا
 ہے یہ پانی آبِ حیاں سے سوا
 دردِ دل ہے دردِ ملت کی دوا
 جس کی رکھتے ہیں اخوت پر پنا
 یونین، الفرض، اخوان الصفا
 ”لیس للانسان الا ما سعی“
 صبحدم اللہ اکبر کی صدا
 ہر جرس میں ہے یہاں شورِ درا
 جگمگا دے ان چراغوں کی ضیا
 ایک پیرِ ناتواں ہے ناخدا
 تا ابد قائم رہے تیری سبھا !

یا رب این بزمِ چمن آباد باد !
چشمِ ما روشن، دلِ ما شاد باد !

الفرض

انجمن الفرض کے افتتاحی جلسہ میں پڑھی گئی۔

اُٹھو، اے سونے والو ! خوابِ شیریں کا مزا کب تک
رہے گی لے اتر مرغِ سحر خواب کی صدا کب تک
رہے گا خود فراموشی سے پیانِ وفا کب تک
چلے گی صحنِ گلشن میں یہ خواب اور ہوا کب تک
ہمیں اک ناصحِ جان سوزِ دردِ دل سناتا ہے
یونہی ناکام پھر جائے گی ہاتف کی ندا کب تک
اُٹھو، اے نوجوانو ! رہ نورِ شوق بن جاؤ
کرے گا سیرِ عالم کی یہ پیری کا عصا کب تک
”شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابِ چنین ہائل“
لڑے گا موجِ طوفان سے اکیلا ناخدا کب تک
دلوں میں حبِ اخواب ہے تو یہ لوگو و چوگاں ہے
حکایاتِ سلف تا کے، غرورِ ماضی کب تک
”ہمہ کارم ز خود کامی بہ بدنامی کشید آخر“
شکایتِ آسمان کی، دورِ گردوں کا گلا کب تک
اُٹھو اور بزمِ ملت کو کرو آلفت سے نورانی
رہے گی گھر ہی گھر میں ان چراغوں کی ضیا کب تک

شمیمِ روحِ سرور سے یہ باغ و راغ مہکا دو
 یہ گلزارِ جوانی کی بہارِ جاں فزا کب تک
 کچھ اس منزل میں اپنا چھوڑ کر نام و نشان جانا
 یونہی اس رہ میں مٹ جائیں گے اپنے نقشِ پا کب تک
 ”سخنِ گفتی و درستی، بیا و خوش بخوان“ ناظر
 یہ جمعِ دلکشا کا ہے، یہ بزمِ دل رہا کب تک

ہدیۂ دربارِ انجمنِ حمایتِ اسلام

قومی خزاں

گر یہ رنگِ گردشِ دوار ہے گر زمانے کی یہی رفتار ہے
 گر تنازع میں توانا کی ہے جیت اور ضعیف و ناتواں کی ہار ہے
 ہے اگر فائقِ پیادے سے سوار مست پر غالب اگر ہشیار ہے
 ہے اگر گرداب میں غفلت کی ناؤ اور ہمت کا جو بیڑا پار ہے
 باعثِ اقبال ہے گر اتفاق بغض و کین گر موجبِ ادبار ہے
 ”لیس للانسان الا ما سعی“ بے عمل گر زندگی بیکار ہے
 گر ہے عالم کی جہاں میں آبرو گر یونہی جاہل کی مٹی خوار ہے
 الغرض، گر ہے یہی قانونِ دہر
 قوم کی منزل بہت دشوار ہے

کر سکیں گے قوم کا کیا کام ہم خود غرض، خود ہیں اور خود کام ہم
 کہتے ہیں منبر پہ جن کو ناروا گھر میں کرتے ہیں وہی سب کام ہم

خدارا یہ سب خانہ جنگی مٹا دو یہ سنی و شیعہ کے جھگڑے چکا دو
بس اک گھاٹ پر سارے لنگر گرا دو یہ دریا میں سب ندیاں پھر ملا دو

جو بھائی سے بھائی جدا کر رہے ہیں

یہ مسلم کی ہستی فنا کر رہے ہیں

متاعِ ادب ہے فسوں و فسانہ جوانی کا سرمست رنگیں ترانہ
تصاویرِ عریاں کا تصویر خانہ خرافات کا عاشقانہ خزانہ

نہ اس میں حقائق ہیں کچھ خشک و تر کے

نہ اس میں معارف ہیں علم و ہنر کے

سخنِ نغمہ پیرا جواب سو بسو ہے یہ جوشِ جوانی کی سب باؤ ہو ہے

وہ صہبائِ عرفان، نہ جام و سو ہے زبان پر مگر ساغرِ مشک بو ہے

نہیں شاعروں کو کوئی کام باقی

بس اک عشق کا ہے سرانجام باقی

امیر اپنی روداد سے بے خبر ہیں غریبوں کی افتاد سے بے خبر ہیں

وہ نادار و ناشاد سے بے خبر ہیں وہ برداد و بیداد سے بے خبر ہیں

اگر صرف زر ہے تو ہے موٹروں میں

الکشن کے جھگڑوں میں یا ووٹروں میں

شرابِ تعیش سے سرشار ہیں وہ ہوسِ کاریوں میں گرفتار ہیں وہ

دف و چنگ کے بس خریدار ہیں وہ پرستارِ خوبانِ بازار ہیں وہ

غلط بخشوں میں تو مشہور ہیں وہ

مگر قوم مانگے تو معذور ہیں وہ

زمانہ میں اک زلزلہ آ رہا ہے کہ فرشِ زمیں جس سے تھرا رہا ہے

تنعم کے وہ بتکدے ڈھا رہا ہے بتوں کو تعیش کے ٹھکرا رہا ہے

جو قوم سے لو لگا رہے ہیں، وہ تقدیر جاں تک لٹا رہے ہیں
وہ قصرِ قومی بنا رہے ہیں، بنائیں اپنے گھروں کی ڈھا کر
ہیں جن کے سینوں میں دل پھڑکتے، وہ مشکلوں سے نہیں جھجکتے
ہیں مثل پروانہ سر پٹکتے وہ عشق میں بال و پر جلا کر
ہیں راہرو گرتے پڑتے جاتے، رہ ترقی میں بڑھتے جاتے
ہیں بامِ عزت پہ چڑھنے جاتے، کمندِ ہمت لگا لگا کر
اللہی، خیر اپنے قافلے کی! نہیں جسے فکرِ مرحلے کی
یہ مستِ خواب اب بھی سو رہے ہیں، تھکے سب ان کو جگا جگا کر
کچھ ایسی تقدیر ان کی پھوٹی، کہ اوجِ عزت کی آس ٹوٹی
ابھی تو شاخِ مراد سے یہ گرے ہیں جھولے جھلا جھلا کر
یہ دولت و ملک و کامرانی تو سب بہاریں تھیں آئی جانی
مگر یہ سیلاب کی روانی تو لے گئی دین و دل بہا کر
دلوں میں اپنے نہاں ہیں کینے، بھرے ہیں بغض و حسد سے سینے
یہ رہ گئے قوم کے دھینے، وہ گنجِ آفت لٹا لٹا کر
ہے رہناؤں کا زور ہر سو، ہے پیشواؤں کا شور ہر سو:
بنائے کیا کیا طلسمِ کثرت، وہ رنگِ وحدت مٹا مٹا کر
رہو گے اس دار و گیرِ دوراں میں، ہمدرد! مستِ خواب کب تک؟
رہے گی امواجِ جاں ستاں میں یہ آن بان، اے حباب! کب تک؟
خدا کی رحمت ہو اہل دل پر، جو قوم کا غم ہیں کھانے والے
مجالسِ آس کی سجانے والے، سفر کی زحمت اٹھانے والے
ہیں صدرِ بزم اپنے فخرِ دوراں، وہ ملتوں کے ملانے والے
چہار یار اور پنج تن کی کدورتوں کو مٹانے والے

سدا رہا ان کا فیض جاری ، رہیں منت ہے قوم ساری
 الہی ان کو بنائے رکھنا ، ہیں اپنی بگڑی بنانے والے
 یہ افضل الفاضلین دہلی ، یہ اکمل الکاملین دہلی
 کلام حق کی دکھا کے مشعل ، دلوں کی ظلمت مٹانے والے
 ادیب ملت ، خطیب ملت ، حبیب ملت ، طیب ملت
 زبان معجز بیاں کا اپنی جہاں میں سکھ بٹھانے والے
 وہ میرے استاد ذوالمعالی ، لسانِ اسلام خواجہ حالی
 بتوں کی آفت چھڑانے والے ، وہ قوم سے لو لگانے والے
 رہے سدا ہم یہ ظلِ عالی ، الہی! ایرانِ زندہ دل کا
 وگرنہ عالم میں پھر نہ دیکھیں گے صورتیں یہ زمانے والے
 ہے سخت قحط الرجال ہم میں ، ہے باکمالوں کا کال ہم میں
 نہ اہل جاہ و جلال ہم میں ، نہ مال و دولت خزانے والے
 ہیں موجِ دریا پر خطر میں یہی تو اب نساؤ کے کھویا
 یہ کوٹ پتلون ٹائی والے ، یہ آننے والے ، شانے والے
 سنیں یہ روداد انجمن کی سب اہل پنجاب گوشِ دل سے
 ہم اپنی قسمت کا فیصلہ آج قوم کو ہیں سنانے والے
 جو بھیک پر ہو مدارِ ہستی تو کچھ نہیں اعتبارِ ہستی
 ہم آج کالج کی زندگی کا ہیں تم سے بیمہ کرانے والے
 مکان کی اب داغ بیل ڈالو ، دئے میں جلد اس کے تیل ڈالو
 وگرنہ اس کا چراغِ ہستی ہیں کوئی دن میں بجھانے والے
 نئی بنائیں بنانی ہوں گی ، چھتیں پرانی گرانی ہوں گی
 کہ حکمِ حاکم سے فیلبانوں کو ہم ہیں مہاں بنانے والے

غضب ہے اک درسگاہِ قومی کے ہیں بنائے سے آج قاصر
 تھے جن کے اسلاف روضہ تاج و بیتِ حمرا بنائے والے
 یہ سچ کہا ہے کسی نے بہتر ہے موت بے صرفہ زندگی سے
 ہم اپنی ذلت سے نامِ اسلام پر ہیں دھبہ لگانے والے
 نہیں جہاں میں کہیں ٹھکانا، جز آستانِ شہِ دو عالم
 کہ جس کے دربار میں ملائک ہیں عجز سے سر جھکانے والے
 وہ جلوۂ ذاتِ ذوالجلالی، وہ مظہرِ شانِ ذوالجلالی
 کہ جس کے در پر سدا سوالی مرادیں دل کی ہیں پانے والے
 وہ اہل زور اور مکر و فن کے طلسمِ حیرت مٹانے والے
 وہ چشمِ اہل جہاں کو نورِ خدا کا منظر دکھانے والے
 وہ ہفت کشور میں عدل و انصاف کی منادی کرانے والے
 وہ چار دانگِ جہاں میں وحدت کی پنج نوبت بجانے والے
 ہمارے آقا! ہمارے والی! ہیں آستانِ پر ترے سوالی
 یہ نونہالانِ باغِ ملت کو گودیوں میں کھلانے والے
 سلام و صلوات تم پہ لاکھوں، شفیعِ روزِ جزا ہمارے
 نہیں ہے بیڑے کو خوفِ طوفاں جو آپ ہیں ناخدا ہمارے

آیاتِ بینات

حسنِ فطرت دشت میں، صحرا میں، گلزاروں میں دیکھ
 نورِ وحدت چاند میں، سورج میں، سیاروں میں دیکھ

ہے کہیں شائبِ جالی اور کہیں شائبِ جلال
 لالہ زاروں میں نظر کر اور کہساروں میں دیکھ
 پتے پتے سے عیاں ہے طرزِ تحریرِ ازل
 مرغزاروں میں تماشا کر، چمن زاروں میں دیکھ
 ہے اسی گلِ پیرہن کی گل میں شائبِ رنگ و بو
 شاہدِ قدرت کے رخساروں کو گلزاروں میں دیکھ
 طائروں سے صبح دمِ پیم کا تو پیغام سن
 شامِ سندر شام کے خاموش نظاروں میں دیکھ
 یارِ ہرجائی اسیرِ کنجِ تنہائی نہیں
 حسنِ یوسفؑ مصر کے کوچوں میں، بازاروں میں دیکھ
 جلوہ گر نورِ حقیقت سے ہے فانوسِ مجاز
 مہجینوں کی جبین میں دیکھ، رخساروں میں دیکھ
 دن کی یہ صورت گری اور رات وہ تاروں بھری
 ہاتھ نقاشِ ازل کا آس کے شہکاروں میں دیکھ
 دیدنی ہے زیرِ گردوں اتحادِ خشک و تر
 بارشِ ابرِ کرم کھیتوں میں، گلزاروں میں دیکھ
 اتفاق ہو نہیں سکتا یہ نظمِ کائنات
 کارِ فرما قاعدے قدرت کے درباروں میں دیکھ
 ہندسہ کا لے سبق گردش سے مہر و ماہ کی
 اور ریاضی کا عمل گردوں کے سیاروں میں دیکھ
 دائمی رد و بدل کا راز بے جانوں سے پوچھ
 زندگی اور موت کے اسرار جاں داروں میں دیکھ

ہے حجابِ حق شناسی گر ترا علم و ہنر
 دفترِ یونان کو خاک آلودہ انباروں میں دیکھ
 ہے تجھے ملک و جہاں بانی پہ گر اپنی غرور
 قیصر و فغفور کو آس کے عزاداروں میں دیکھ
 گر ترا تحتِ حکومت جلوہ گاہِ ناز ہے
 پومپائی کے کھنڈر لاوے کے انباروں میں دیکھ
 ہیں شرابِ شوق سے مغرب کے مے خانے تہی
 یہ سرورِ سرمدی مشرق کے مے خواروں میں دیکھ
 حق پرستوں کی مجالس میں سرودِ صلح سن
 اور پجاری نفس کے مصروفِ پیکاروں میں دیکھ
 گر نہ دیکھے شمعِ عرفان اونچے ایوانوں میں تو
 چھپروں میں دیکھ، ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں دیکھ
 آشنا کر دردِ آفت سے دلِ خود کام کو
 عشق کو پھر حسنِ فطرت کے پرستاروں میں دیکھ
 عقل کی کشتی میں ایمان کا اگر لنگر نہیں
 آس کو گردابِ تباہی کے گرفتاروں میں دیکھ
 فلسفے کی وادیوں میں کر تلاشِ اقبال کی
 ناظرِ گم گشتہ کو قدرت کے نظاروں میں دیکھ

آنچہ ما در کار داریم...

کیا سبب پستی کا تیری مسلمِ دیں دار ہے؟
 کس لیے تو پائمالِ چرخِ کج رفتار ہے؟

انقلابِ دورِ دوراں بے سبب ہوتا نہیں
 علت و معلول کی عالم میں گیر و دار ہے
 آنکھ کیوں، اے نیند کے ماتے! تری کھلتی نہیں؟
 ذرہ ذرہ جب فضاءِ دہر کا یسدار ہے
 تو نہ بدلا اور زمانے کی گئی حالت بدل
 ہے پرانا مال تیرا اور نیا بازار ہے
 کوئی طوفان بے تمیزی کا کہیں سے جب آٹھے
 اس میں مسلم کود پڑنے کے لیے تیار ہے
 معشرِ اسلام ہے اک کارواںِ گم کردہ راہ
 جس کا ہر غولِ یساہانِ قافلہ سالار ہے
 اشتہاری لیڈروں کی گرہی ہے بھیڑ بھاڑ
 رہبرِ مخلص کی منزل، ہمرہاں! دشوار ہے
 جم گئے ان پہلوانوں کے اکھاڑے سو بسو
 جن میں صبح و شام باہم جنگ ہے، پیکار ہے
 قوم کی تعلیم سے ان کو تغافل کیوں نہ ہو
 ہر اکھاڑے کے لیے چندہ انہیں درکار ہے
 ناخداۃ قومِ نوے فی صدی گر ڈوب جائیں
 پھر یقیں جانو مسلمانوں کا یسٹرا پار ہے
 قوم کی شیرازہ بندی کے دئے ٹانگے آدھیڑ
 واعظوں کو اب بھی باہم بحث ہے، تکرار ہے
 ہاتھ میں ہے ”شور بازاروں“ کے گر ملت کی باگ
 گردنِ مسلم ہے اور تکفیر کی تلوار ہے

جاء عبرت ہے کہ اورنگِ امان اللہ پر
 جلوہ آرا ایک سقہ بچہ غدار ہے
 پافور میں مسلم کے ہے زنجیرِ تقلیدِ رسوم
 شیخ کی تسبیح میں بھی رشتہ زُئار ہے
 جنسِ نازک کے بھی نشو و ارتقا کے واسطے
 روشنی، تعلیم اور تازہ ہوا درکار ہے
 ناز تھا مسلم کو اپنی تندرستی پر کبھی
 مسلمہ سب عارضوں کی اب اجارہ دار ہے
 ہم دہو! حوا کی یٹی شجرۂ آمید ہے
 اور نسلِ ابنِ آدم اس کا برگ و بار ہے
 نصفِ بہتر جسمِ مسلم کا اگر مفلوج ہے
 بالیقین جانو کہ جسمِ قوم سب لے کار ہے
 قوم کی علمی مجالس کا جو منظر دیکھیے
 شاعروں کی فوج ہے اور عشق کی سرکار ہے
 آسمان تک نردبانِ علم سے پہنچے حریف
 یابِ کمندِ آرزو ہے اور بامِ یار ہے
 رائگاں کاوش میں ہیں کتنے فلک پیمایاں دماغ
 کس قدر سرمایہ ذہن رسا لے کار ہے
 جنسِ کاسد را خریدارے دریں بازار نیست
 ”آپچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست“

پیامِ حالی

یہ نظم انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء کے لیے لکھی گئی۔
مگر میں بوجہ علالت طبع جلسہ میں شامل نہ ہو سکا اور نہ نظم
ارسال کر سکا۔

ملے خواب میں شب مجھے خواجہ حالی وہ گنجِ معارف، وہ کنزِ معالی
منور ہوئی جب یہ بزمِ خیالی ہوا آن سے با چشمِ خم میں سوالی
کہ یوں چل دے خواجہ کیوں چپ چپاتے :
پیام اپنا بندوں کو کچھ دیتے جاتے
بھری آہ حالی نے سوزِ جگر سے جھڑی آنسوؤں کی لگی چشم تر سے
جبینِ مبارک سے انوارِ بر سے یہ فرمایا: کہدو یہ اہل نظر سے
ہے جب تک ”مد و جزرِ اسلام“ باقی
جہاں میں ہے حالی کا پیغام باقی
زمانہ میں صرصر کا طوفاں وہی ہے خزاں دیدہ اپنا گلستاں وہی ہے
عداوت وہی بغضِ اخواں وہی ہے مسلمان کا دشمن مسلمان وہی ہے
عجب شورِ محشر بپا ہر طرف ہے
جسے دیکھیے آج خنجر بہ کف ہے
نئے بتکدے اور بتگر نئے ہیں پجاری نئے اور مندر نئے ہیں
نئے دام اور مرغِ بے پر نئے ہیں ہیں راہیں نئی اور رہبر نئے ہیں
یہ سب ناخدا یاں ملت ہمارے
”اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے“

مجالس میں گر وعظ کی جائیے گا وہی میرا پیغام دہرائیے گا

جو مسلم کی تکفیر فرمائیے گا خطا کیجیے گا، خطا کھائیے گا
جماعت کو گر منتشر کیجیے گا
تو ویراں یہ آباد گھر کیجیے گا

خدا سمجھے اِن پیشوایانِ دین سے جو اترے زمیں پر ہیں عرشِ بریں سے
الگ ہو کے جو راہِ دینِ میتیں سے جگاتے ہیں فتنے نئے بغض و کین سے
الگ اُن کی مسجد ہے ، منبر الگ ہے
الگ اُن کی امت ، پیغمبر الگ ہے

بیچھا دامِ تزویریاں سو بسو ہے نزولِ امامِ زماں کو بکو ہے
زباں پر تو ”اللہ ہو“ ”اللہ ہو“ ہے مگر مغزِ جاں میں مزعفر کی بو ہے
جہاں میں یہ کثرت ہو جب ابلہ ہی کی

تو پھر پانچوں گہی میں ہیں ہر مدعی کی
یہ موتی تھے سب ایک کانِ گہر کے یہ سب شاخ و برگ ایک ہی تھے شجر کے
جو تھے حلقہ در گوش خیر البشر کے بنے امتی زید و بکر و عمر کے
بتوں کو ہیں کعبہ میں پھر لانے والے

یہ فرزندِ توحید کہلانے والے
یہ سنی و شیعہ میں تکرار کیوں ہے؟ یہ مسلم کی مسلم سے پیکار کیوں ہے؟
مدیحت، مذمت پہ اصرار کیوں ہے؟ تماشا سر کو و بازار کیوں ہے؟

لڑائی کا دنگل ہر اک انجمن ہے
جہاں اس خرافات پر خندہ زن ہے

ہے اپنوں سے ہر دم لڑائی تمہاری ہے اک دوسرے پر چڑھائی تمہاری
یہ بازار میں ہاتھ پائی تمہاری یہ اغیار میں جگ ہنسائی تمہاری
اچھالا مسلمان کا ہے نام تم نے
ڈبویا ہے ناموسِ اسلام تم نے

اسلام کی چھوڑ کر رہ و رسم ہستی کو نہ اپنی تم مٹانا
جمہور کا فیصلہ ہو جو کچھ فرمانِ قضا آئے بنانا
ہو قوم کا اعتقاد جس پر اس کو سروچشم پر بٹھانا
یاروں کو تھا گر ملال مجھ سے اُس کو مرے ساتھ ہی دبانا

کہنا مری بزم سے خدا را
”حیوا، یا ایہا السکاری!“

اے مونس و ہمدرد یگانہ! اے مہدی و محسنِ زمانا!
دل میں رہے درد کی وہی چاٹ لب پر رہے قوم کا ترانا
وہ میری صدا ”أطلبوا العلم“ ہر خرد و بزرگ کو سنانا
لے کر مرا کاسہ گدائی ہر شہر و دیار میں پھرانا
اے کانِ ادب، نذیرِ دہلی! آمت کو عذاب سے ڈرانا
ہے تیری زباں میں جوہرِ تیغ اس سیف کو زنگِ مت لگانا
حالی! نہ ہو بزمِ تجھ سے خالی وہ نغمہ درد گائے جانا
ہیں تیرے سرشک سیلِ رحمت یہ مزرعِ قوم پر بہانا
اقبالِ گزشتہ کا مرقع شبلی! مری بزم کو دکھانا

برہم ہوئی گرچہ بزمِ ساقی

چرچا رہے میکشوں میں باقی

کہیو جا کر مرے چمن میں اس لالہ و گل کی انجمن میں
تم پھول ہو کشتِ آرزو کے تم جان ہو قوم کے بدن میں
پہنچو لیے کاسہ گدائی پنجاب میں، ہند میں، دکن میں
لے جاؤ مرا پیام پہلے اُن زندہ دلوں کی انجمن میں
تھا جن کے دلوں پہ میرا جلوہ یا عکسِ سہیل تھا یمن میں
ہے قوم کا اُن کے سر میں سودا اور آتشِ عشق تن بدن میں

وہ عسرت کو عسرت سے ٹکرا رہا ہے منجم فلک کا یہ فرما رہا ہے
 غریبوں سے غافل جو ہو کر رہیں گے
 امیری کا بیڑا ڈبو کر رہیں گے
 الکشن کی آتری جو نیلم پری ہے کرشموں میں کافر کے جادو گری ہے
 مغل، شیخ، افغان ہے یا چودھری ہے پلیڈر ہے، لیڈر ہے یا مولوی ہے
 ہر اک حب اسلام کا مدعی ہے زبانوں پہ تکبیر و نعت نبیؐ ہے
 مگر دل سے ہیں سب الکشن کے بندے
 الکشن کے جال اور الکشن کے پھندے
 ادھر خرچ موٹر ادھر صرف ووٹر ادھر لاریوں نے نکالا پلستر
 بس اب گھر میں باقی ہے زراور نہ زیور اگر قوم کی اب خبر لیں تو کیونکر
 زمین ہو گئی رہن اور گھر گرو ہے
 یہاں تک کہ بیوی کا جھومر گرو ہے

ہیں مفلس بہت اور نادار ہم میں جوانوں کی کثرت ہے یکار ہم میں
 نہ صنّاع ہم میں، نہ تجار ہم میں نہ تنظیم حرفت کے آثار ہم میں
 علاج اس کا بس اشتراکِ عمل ہے
 ترقی کا نسخہ یہی ہے بدل ہے
 وہ گو علم کی قدردانی نہیں ہے وہ دجلہ میں پہلا سا پانی نہیں ہے
 مگر دولتِ علم فانی نہیں ہے بجز علم کے زندگی نہیں ہے
 جو یہ چشمہ فیض جاری رہے گا
 تو انسان پہ حیوان نہ بھاری رہے گا

اخوت

یہ میری دوسری انعامی نظم ہے اور علیحدہ طبع ہو کر انجمن حمایت اسلام کی نذر ہو چکی ہے۔ مگر بعض احباب کے اصرار سے اس کا ضروری حصہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

بجا ناز مسلم کو اس بات پر ہے
پراگندہ ہیں گرچہ عالم میں سارے
وہ صحراء سوڈان کے رہنے والے
وہ گودیکھنے میں سید فام سے ہیں
پڑے ہیں قناعت سے ریت اور بن میں
ٹرفلی میں، تونس میں، الجیریا میں
ملیبار میں اور ابی سینیا میں
سناتے ہیں مینار مسجد میں چڑھ کر
بہت اہل اسلام ہیں چینوں میں
پرستار وحدت ہیں گوتم کے گھر میں
ابھی نسل باقی ہے تورانیوں کی
وہ غزنی و کابل کے شاہی گھرانے
ابھی ان کے بازو میں قوت وہی ہے
ہیں رستم ابھی زاولستان میں باقی
عرب تھا جو سرچشمہ دین ہدی کا
ابھی گرمی بزم اسلام ہے واں
ابھی اہل بطحا کی عزت وہی ہے

کہ ساری خدائی مسلمان کا گھر ہے
بہت ہیں ابھی زور بازو ہمارے
ہیں بھائی ہمارے بہت کالے کالے
منور مگر نور اسلام سے ہیں
وہ کرتے ہیں یاد خدا سادہ پن میں
مراکش میں اور مصر میں، نو بیامیں
ملایامیں، جاوامیں، سوماترا میں
سمندر کی لہروں کو "اللہ اکبر"
گھرا دین برحق ہے بے دینیوں میں
تناسخ کا چکر نہیں آن کے سر میں
ابھی گرم محفل ہے ایرانیوں کی
زمانے کو از بر ہیں جن کے فسانے
ابھی خونِ غیرت میں حرکت وہی ہے
ابھی لعل ہیں اس بدخشاں میں باقی
ابھی آس میں آباد ہے گھر خدا کا
وہی میکہ ہے، وہی جام ہے واں
ابھی خاکِ یثرب کی عظمت وہی ہے

یہی سرزمین قبلہ مومنین ہے
وہی قوم میں عز و شانِ عرب ہے
بہت پہنچے یاں دام و صیاد اب تک
فلسطین و شام اور عراق اور امن
جو گہوارۂ انبیاء رہ چکے ہیں
یہ شیداء قوم اور محب وطن ہیں
وہ اسلام کی صورتیں ارغوانی
لرزتے تھے رومن شجاعت سے جن کی
ظفر موج، یا رب! ہو فوج کمالی
وہ بے ساز و سامان غزا کرنے والے
یہ عثمانیوں کی شجاعت رہے کی
ادھر مدتوں آندلس کی زمیں پر
تمدن کا یاں ڈول ڈالا عرب نے
شکستہ بہت قصر و مہمانسرا ہیں
مگر قرطبہ میں جو ڈوبا تھا اختر
ہے تثلیث کا سرد بازار آس میں
مساجد کا منظر فرنگی فضا میں
مسیحی جو اسلام میں آ رہے ہیں
وہاں تیر پہنچا نہ شمشیر پہنچی
مگر دین بیضا کی تنویر پہنچی
پھر اے مسلم خفتہ، بیدار ہو جا!
تو اے غنچہ، گلزارِ توحید بن جا!
یہ سینہ پھر آئینہ طور کر دے
پھر اے مستِ غفلت تو ہشیار ہو جا!
تو اے ذرہ، پیغامِ خورشید بن جا!
یہ ظلمت کدہ دل کا پر نور کر دے

اگر دل کو ایمان سے معمور کر دے
ادھر فرش پر حق کی آواز تو تھا
بلندی سے اتنی گرایا گیا ہے
ہے آمت میں تو خاتم المرسلینؐ کی
امانت میں تیری یہ کون و مکان ہے
جب ایمان سے ملت کا بازو قوی تھا
وہ پیکار ہستی میں خنجر بکف تھا
سوارِ عرب خانہٴ زین میں جمنا
مسلمان کا گر کشتِ ایمان وہی ہے
اگر خونِ سام و نریمان وہی ہے
جنوں کا اگر ساز و سامان وہی ہے
وہی نجد و خارِ مغیلاں وہی ہے
یہ وقتِ مدد! اے شہِ دو جہاں! ہے
زمینِ سخت، نامہرباں آسماں ہے
نہ دولت، نہ حشمت، نہ جام و سبو ہے
ترے نام سے لو لگائے ہوئے ہیں
شکستہ دلوں کا یہی ہے سہارا
ذرا رخ سے کملی کا پردہ اٹھا دے
صدا پھر وہ کوہِ صفا کی سنا دے
وہی سر کو مسلم کے سودا عطا کر
وہ جامِ آس کو، ساقی! کوثر! عطا ہو
وہ آئینہٴ دل کو آس کے جلا دے
کہ ہستی کے سب نقشِ باطل مٹا دے

اگر دل کو ایمان سے معمور کر دے
 ادھر فرش پر حق کی آواز تو تھا
 بلندی سے اتنی گرایا گیا ہے
 ہے امت میں تو خاتم المرسلینؐ کی
 امانت میں تیری یہ کون و مکان ہے
 جب ایمان سے ملت کا بازو قوی تھا
 وہ پیکار ہستی میں خنجر بکف تھا
 سوارِ عرب خانہٴ زین میں جمنا
 مسلمان کا گر کشتِ ایمان وہی ہے
 اگر خونِ سام و نریمان وہی ہے
 جنوں کا اگر ساز و سامان وہی ہے
 وہی نجد و خارِ مگیلاں وہی ہے
 یہ وقتِ مدد اے شہِ دو جہاں! ہے
 زمینِ سخت، نامہریاں آسماں ہے
 نہ دولت، نہ حشمت، نہ جام و سبب ہے
 ترے نام سے لو لگائے ہوئے ہیں
 شکستہ دلوں کا یہی ہے سہارا
 ذرا رخ سے کملی کا پردہ اٹھا دے
 صدا پھر وہ کوہِ صفا کی سنا دے
 وہی سر کو مسلم کے سودا عطا کر
 وہ جامِ آس کو، ساقی کوثر! عطا ہو
 وہ آئینہٴ دل کو آس کے چلا دے
 کہ ہستی کے سب نقشِ باطل مٹا دے
 تو مسلم زمانہ کو مسحور کر دے
 ادھر عرش تک گرم پرواز تو تھا
 کوئی غل و غش تجھ میں پایا گیا ہے
 خلافت ملی تجھ کو روءِ زمیں کی
 سر و دوش پر تیرے بارِ گراں ہے
 مسلمان کا جب بغض و کین للہی تھا
 وہ سر مستِ خم خانہٴ "لا تعسف" تھا
 تو صحرا سے رکتا، نہ دریا سے تھمتا
 تو پھر رحمتِ حق کا نیساں وہی ہے
 تو میدان وہی گو و چوگان وہی ہے
 کہ بھر کارواں سوء منزل رواں ہے
 سموم و زان ہے تو ریگِ تپاں ہے
 اب اس آجڑی بستی میں بس تو ہی تو ہے
 جہیں تیرے در پر جھکائے ہوئے ہیں
 کہ تو ہے بہارا، تو سب کچھ بہارا
 وہ عالم کو شانِ جمالی دکھا دے
 کہ سوتوں کو خوابِ گراں سے جگا دے
 وہ دیوانے کو اپنے صحرا عطا کر
 کہ رگِ رگ میں غربت کا طوفان پیا ہو
 وہ آئینہٴ دل کو آس کے چلا دے
 کہ ہستی کے سب نقشِ باطل مٹا دے

کافی آغا خانی

یہ نظم ہزبائینس آغا خان کی مشہور تحریک، افتتاح مسلم یونیورسٹی،
کے زیر اثر لکھی گئی۔

آج نئی سچ دھج سے فلک پر چاند ستارے پھرتے ہیں
کچھ تو بتا احوال، نجومی! دن بھی ہمارے پھرتے ہیں؟
قافلہ سالار اپنا بنا ہے آج وہ ترک شیرازی
وہ جس رخ کو پھرتا ہے، اُس رخ کو سارے پھرتے ہیں
آج وہ سلطان کشورِ دل کے درویشی پر لوٹ ہوئے
ہاتھ میں لے کر جامِ گدائی دوارے دوارے پھرتے ہیں
آج سرِ بازار سنا ہے یوسفؑ مصری بکتا ہے
سوت کی اٹی لے کے بغل میں، ہم بھی بھارے پھرتے ہیں
دشتِ طلب کے راہ نوردو! بانگِ جرس کے ساتھ چلو
یاں سنگت سے بچھڑنے والے مارے مارے پھرتے ہیں
کم ہمت یاں موجِ بلا میں چکر کھاتے رہتے ہیں :
ہمت والے اوجِ سما پر لے کے غبارے پھرتے ہیں
بامِ ترقی پر چڑھ جاؤ، بل پہ کمندِ وحدت کے
شمس و قمر بھی چرخِ بریں پر اس کے سہارے پھرتے ہیں
اے ساقی! تری محفلِ باقی، وہ جامِ گلِ رنگِ ہلا
جس کے اثر سے خستہ رگوں میں خوں کے فوارے پھرتے ہیں
چھیڑ حجازی لے میں مغنی پھر وہی آتشِ خیز نوا
اب بھی فضاءِ دشت و جبل میں جس کے شرارے پھرتے ہیں

اب تک جرعهٔ ساغرِ جم کی خاکِ عجم متوالی ہے
 پھر کیوں وارثِ دولتِ جم کے ہمت ہارے پھرتے ہیں؟
 حسنِ جہاں آشوب کے تیرے ایک جہاں میں جلوے تھے
 جاناں! دیدہٗ ناظر میں اب تک وہ نظارے پھرتے ہیں

یادِ رفتگان

میرزا حسن

معاذ اللہ! وہ تاریکی سوادِ کفر و ظلمت کی
 فضا ساکت، ہوائیں سرد خواہستانِ غفلت کی
 فضاء ہند پر چھائی تھی اک افسردگی پر سو
 بلاؤں کی طرح منڈلا رہی تھی تیرگی پر سو
 تصور صبح کا گم تھا دماغِ شب پرستار میں
 تجلی سو رہی تھی سینۂ مہرِ درخشاں میں
 بلائیں فتنہٗ دوران کی چوکھٹ چوم کر اٹھیں
 گھٹائیں کالی کالی ہر طرف سے جھوم کر اٹھیں
 ہواؤں کے تھپیڑوں میں تھی شمع مضمحل دل کی
 مسافر کے لیے گم ہو چکی تھی راہ منزل کی
 ارادے راستہ بھولے کچھ ایسی تیرگی چھائی
 فریبِ روشنی دینے لگے غولانِ صحرائی
 وہ نکلا دفعتاً سینہ سے تاریکی کے اک تارا
 وہ تارا جس کو کہیے مطلعِ مشرق کا سیارا

وہ تارا سب سے پہلے جس نے کھولی آنکھ طوفان میں
 وہ تارا جو پیامِ روزِ روش تھا شبستان میں
 وہ تارا دیکھ کر جس کو اٹھے سارے شبستانی
 جیب پر جس کے لکھی تھی حدیثِ صبحِ نورانی
 وہ تارا جس کی تابش سے طلوعِ شمس کا دھوکا
 وہ تارا جس کی تابش سے نظر آنے لگا رستا
 وہ تارا جس کو کہیے اخترِ تقدیر گمراہاں
 وہ تارا جس کو کہیے سیدِ مرحوم احمد خاں
 وہ سر سید کہ جس کو اس چمن کا باغبان کہیے
 نسیمِ جانفزاں نو بہارِ گلستان کہیے
 وہ سر سید کہ جس نے فکر کی دنیا بدل ڈالی
 فضاءِ مادیِ ملتِ بیضا بدل ڈالی
 وہ سر سید ہوئیں بیدار موجیں جس کے افسوں سے
 وہ سر سید ارادے جس کے ٹکراتے تھے گردوں سے
 وہ سید جانتا تھا گر جو قوموں کے جھکانے کا
 وہ سید جس کے ہاتھوں میں گریباں تھا زمانے کا
 نگاہِ دوریں نے جس کی فتنوں کو جری دیکھا
 ضمیرِ سنگ میں رقصِ بتانِ آذری دیکھا
 اذانِ سوئی ہوئی بستی میں دی اٹھ کر سویرے سے
 نکالا صبحِ مستقبل کو ماضی کے اندھیرے سے
 ہیں جس کے نقشِ پا پر قافلے گرمِ خرام اب تک
 فضاءِ ہند میں گونجا ہے جس کا یہ پیام اب تک

بیانا گل بہ افشالیم و مے در ساغر اندازیم
فلک راستف بشکافیم و طرح دیگر اندازیم

پیام سرسیدؒ

یہ نظم سرسیدؒ کی وفات کے بعد لکھی گئی اور سرسید میموریل فنڈ کے
بعض جلسوں میں نواب محسن الملک مرحوم کے ایما سے پڑھی گئی۔

کل رات جو مجھ کو نیند آئی اک صورتِ خضر دی دکھائی
چہرے پہ برس رہے تھے انوار بشرے پہ جلالِ پادشائی
سر پہر تھی کلاہِ خسروانہ عطر اور عبیر میں بسائی
تھی زینتِ دوش چادرِ نور اور تن پہ قبا تھی سبز کائی
تھی ریشِ دراز پیرہن پر یا نورِ سحر کی جلوہ زائی
طلعت تھی کہ نورِ ذوالجلالی صورت تھی کہ شانِ کبریائی
تھی آنکھ ستارۂ ہدایت ماتھا مہتابِ رہنمائی
القصد، تھی طرفہٴ آس کی روداد جو دید و شنید میں نہ آئی
فرمایا مجھے گئے لگا کر اے کشتہٴ خنجرِ جدائی!
کس حال میں ہے وہ بزمِ مستان مے جس کی ہے موت نے لٹھائی
گر زیرِ فلک کہیں بھی تجھ کو وہ بزمِ فسرده دے دکھائی
اول کہیو سلام میرا

پھر دیجیو یہ پیام میرا

دیرینہ حریف کا فسانا اے ہم نفساں! نہ بھول جانا
تھی جس کی لگائی پود میں نے اس بیل کو تم منڈھے چڑھانا
گمراہ بہت سے راہبر ہیں رہزن کو نہ رہنا بنانا

ہو گئی دیدہ نگراں سے نہاں صورتِ یار

حالِ دل کچھ نہ کہا، بات نہ ہونے پائی

”حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد

رہ گئی سیرِ ندیدیم و بہارِ آخر شد“

آج وہ ہر گز خزاں دیدہ گلستاں میں نہیں

آج وہ حرفِ غلطِ دہر کے دیواں میں نہیں

خوابِ راحت سے نہیں کوئی جگانے والا

روز و شب، شام و سحر اس کے شبستاں میں نہیں

چاند تاروں کی فلک پر بھی محفل ہوگی

اور لحدِ گوہرِ گم گشتہ کی منزل ہوگی

یارِ دلدار! نہ بھولے گی وہ صورتِ تیری

خون رلائے گی ہمیں، ہائے! وہ غربتِ تیری

یاد رہ جائے گی اب دل کے دکھانے کے لیے

وہ حمیت، وہ ظرافت، وہ شرافتِ تیری

مدتوں روئے گی یہ محفلِ احباب تجھے

پر نہیں پائے گی، اے گوہرِ نایاب! تجھے

رکھ دیا کُنچِ لحد میں تنِ بے جاں تیرا

ہو گیا آج وطنِ شہرِ خموشاں تیرا

یارِ دمسازِ پھرے قبر کو مٹی دے کر

لے، نگہبانِ خدا گورِ غریباں تیرا!

نورِ ایمان سے ترے گھر میں آجالا ہو جائے

تجھ کو آغوشِ لحدِ عالمِ بالا ہو جائے

اسلاف کی ہے کچھ ان میں خوبو صورت سیرت میں، سادہ پن میں
 سوکھی کھیتی کو دے گا پانی
 پنجاب کا آبِ زندگانی

مرثیہ

نواب محسن الملک مرحوم

حاضر جاؤں میں ہے صف بستہ قوم ساری
 شملہ سے آ رہی ہے سرکار کی سواری
 بزمِ چمن سے اٹھا ناگہ شورِ ماتم
 جب لاشِ باغبان کی گلزار میں اتاری
 طرزِ خرام سیکھا جس سے سہی قدوں نے
 برقِ اجل نے تاکا وہ سروِ جوئباری
 جس بزمِ دلکشا میں کل عیش کا ساں تھا
 آج آس پہ چھا رہی ہے کیسی یہ سوگواری
 کیا شورِ پاؤں ہو ہے، کمرام سو بہ سو ہے
 ہر آنکھ آبِ جو ہے، ہر لب پہ آہ و زاری
 بزمِ عزا کی حالت جی دیکھ کر بھر آیا
 ہر سر میں شورِ شیون، ہر دل پہ یاس طاری
 اے قوم کے دلارے! خوابِ گراں سے جاگو
 ہے تم کو نیند پیاری یا اپنی قوم پیاری؟
 جانِ جہاں! نہ دیتے تم کو جہاں کے بدلے
 ہجر و وصالِ جاناں ہوتا جو اختیاری

مہدی کی زندگی سے ہمدرد قوم سیکھیں
 رسمِ وفا شعاری، آئینِ جاں سپاری
 ہر راہرو کو اک دن اس رہ سے ہے گزرنا
 احمد کی کل تھی نوبت، مہدی کی آج باری
 اب خوابِ ناز میں ہیں ہم کو جگانے والے
 خلوت میں جاگزیں ہیں جلوے دکھانے والے

پھر مدتوں کے بچھڑے ملتے ہیں یار دونوں
 پھر ہم نشیں پرانے ہیں ہسکنار دونوں
 کرتی رہیں گی روحیں کالج کی پاسبانی
 گو جسم سو رہے ہیں زیر مزار دونوں
 ملت کا درد و غم تھا، جب تک کہ دم میں دم تھا
 کنجِ لحد میں بھی ہیں اب بے قرار دونوں
 چھوڑا نہ بعدِ مردن گلشن کا آشیانہ
 اس بزمِ گل پہ غش تھے مثلِ ہزار دونوں
 یہ قوم کے ستارے، ہندوستان کے پیارے
 تھے فخرِ شہر دونوں، فخرِ دیار دونوں
 تھے ارجمند سب میں اور سر بلند سب میں
 درویش و شہرے تھے لیکن اور خاکسار دونوں
 شانِ آس کی تھی جلالی، اس کی روش جالی
 پر داغِ درد سے تھے دل لالہ زار دونوں
 آسین بندھانے والے، پیاسین بچھانے والے
 پیغامِ یار دونوں، اہرِ بہار دونوں

آل رسولؐ، دونوں، ابنِ بتولؑ دونوں

عالی مقام، دونوں، والا تبار دونوں

تھی موجِ خوش بیانی یا دجلہ کی روانی

معجز بیاں تھے دونوں، جادو نگار دونوں

افسوس ہم سے چھینے بے مہریٰ قضا نے

وہ علم کے دفینے، وہ عقل کے خزانے

وہ قوم کے گدا تھے اور تاج دار دونوں

مخدوم تھے وہ دونوں، خدمت گزار دونوں

تھے بزمِ آخریں کے چشم و چراغ دونوں

اور وضعِ پاستاں کے تھے پاسدار دونوں

پر نور وہ جبینیں، پر آرزو وہ سینے

شامِ خزاں میں بھی تھے صبحِ بہار دونوں

وہ نور کے فوارے، وہ صبح کے ستارے

تھے رہنا ہمارے اور رہ سپار دونوں

مطلع کو آسماں کے گر دیکھتے مکدر

کر دیتے قافلے کو جھٹ ہوشیار دونوں

وہ درد کی صدائیں گونجیں گی ششِ چہت میں

رہتے رہیں گے ان کو لیل و نہار دونوں

ناظر کی ہیں نظر میں وہ جاں فزا نگاہیں

بادی تھے میرے دونوں، آموزگار دونوں

اِن سیدوں کا، یا رب! فردوس میں مکاں ہو!

واں طور کی تجلی اور نور کا سماں ہو!

مرثیہ

خان بہادر محمد برکت علی خان مرحوم

یہ بزم قوم میں کیا شورِ شیون آج برپا ہے
 جنازہ کس شہر بے تاج کا یاں آج نکلا ہے
 دمِ رخصت ہے بام و در پہ اک عالم تماشائی
 سر بازار گویا آج یوسفؑ کا نظارا ہے
 جلو میں اس کے حاضر ہیں یگانے اور بیگانے
 وطن کا ہے وہ پیارا، قوم کی آنکھوں کا تارا ہے
 عزیزوں کو دکھا دو یوسفِ گم گشتہ کی صورت
 شہید قوم کے دیدار کی سب کو تمنا ہے
 گرایا بادِ صرصر نے ہے وہ غلِ چمن پیرا
 کہ ہر سو بزمِ گلشن میں فغاں ہے، شور و غوغا ہے
 وہ حبِ قوم کا پنجاب میں پہلا پیامی تھا
 یہاں قصرِ اخوت کا اسی نے ڈول ڈالا ہے
 کیا لاہور میں اُس نے وہ چشمہ فیض کا جاری
 کہ پنہاں جس کے ہر قطرہ میں مستقبل کا دریا ہے
 تڑپتا تھا اسی پہلو میں وہ بے تاب دل جس نے
 خطابِ ”زندہ دل“ پنجاب والوں کو دلایا ہے
 تھی جنبشِ پانچ دریاؤں میں جس کے جوشِ پیہم سے
 یہیں اس موجِ مضطر نے کیا آخر کنار ہے
 نہ چھوڑا خاکِ دامنگیر نے پنجاب کی تجھ کو
 یہی گورِ غریباں بوسہ گاہِ پیر و برنا ہے

وہ تربت پر تری اللہ کی رحمت برستی ہے
حیاتِ اہل گیتی موت کو تیری ترستی ہے

وہ صدرِ انجمنِ اس بزمِ ملت کو سجاتا تھا

وہی سروِ سہی گلزار کی زینت بڑھاتا تھا

آسی کے دم سے باقی بزم میں تھا رنگِ یکرنگی

وہ جب محفل میں آتا تھا تو سب جھگڑے چکاتا تھا

باسی کے ہاتھ میں شیرازہ تھا قومی جماعت کا

وہ بچھڑوں کو ملاتا تھا، وہ روٹھوں کو مناتا تھا

اٹھایا کاسہ دربوڑھ اس نے قوم میں پہلے

وہ مفلس کے لیے سو نازِ منعم کے اٹھاتا تھا

وہ سر پر بے نواؤں کے رہا ابرِ کرمِ بن کر

وہ دریا سے اٹھاتا تھا تو صحرا پر گراتا تھا

برا کہتا کوئی نا اہل اسے گر ناسپاسی سے

وہ دریاءِ کرامت میلِ چتون پر نہ لاتا تھا

نگاہِ لطف میں اس کی اداءِ دلفریبی تھی

جب اس سے آنکھ ملتی تھی تو وہ دل میں سہاتا تھا

نہ سیم و زر کی کچھ پروا نہ عز و جاہ کا سودا

مگر حبِ وطن میں نقدِ جاں تک وہ لگاتا تھا

خطابوں کا تمنائی نہ شہرت کا تھا شیدائی

مگر جس رہ سے جاتا تھا جہاں آنکھیں بچھاتا تھا

تھی پیری کے زمستان میں بھی گرمیِ نوجوانی کی

شفق میں شام کی نورِ سحر گہی دکھاتا تھا

اجل کے، آہ! جھونکے سے گرا نخلِ چنار اپنا
 کہ جس کے سایہ میں نوخیز سبزہ لہلہاتا تھا
 رہا وہ شمعِ ملت بزمِ دوراں میں ضیا ہو کر
 گیا گلزارِ جنت میں نسیمِ جاں فزا ہو کر

ہر قلم

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم

گلزارِ قوم میں وہ نسیم و صبا نہیں
 بزمِ چمن کی آج وہ رنگیں فضا نہیں
 کل بزمِ گل میں جس کے ترانوں کی دھوم تھی
 گلشن میں اب وہ بلبلِ دستان سرا نہیں
 ہے غم سے آفتاب کے ہر سینہ داغ داغ
 وہ دل نہیں کہ جس کو یہ چرکا لگا نہیں
 طے ہوگی راہِ منزلِ مقصود کس طرح
 گم کردہ راہِ قوم ہے اور رہنا نہیں
 اٹھتا ہے کارواں سے اب آہوں کا اک دھواں
 شورِ جرس نہیں، کہیں بانگِ درا نہیں
 یارانِ نجد قیس کو رو لیں کہ دشت میں
 پھر رہ نورِ شوق کوئی دوسرا نہیں
 ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشیدِ جلوہ گر
 کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

قامت پہ اُس کے پڑتی تھی سرو و سمن کی آنکھ
 گلزارِ احمدی میں وہ جب نونہال تھا
 اُس جنتِ نظارہ میں سورج مکھی کی طرح
 ناظر بھی آفتاب کا محوِ جمال تھا
 گرد و غبارِ دہر کی آلائشوں سے پاک
 پاکیزہ دامن میں وہ برفِ جبال تھا
 تحریر اُس کی بحرِ فصاحت کی موج تھی
 تقریر اُس کی چشمہٴ آبِ زلال تھا
 عمرِ عزیزِ خدمتِ قومی میں کی بسر
 اِس دھن میں محوِ روز و شب و ماہ و سال تھا
 علم و ادب کی ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے
 تنہا وہ رہ نورِ جنوب و شمال تھا
 لایا پیامِ قوم میں تعلیمِ عام کا
 سید کا خاص قاصدِ فرخندہ فال تھا

افسوس! بزمِ قوم میں جو انتخاب تھا
 اُس پر پڑی اجل کی نگہ، انتخاب کی
 مطلع پہ قوم کے شبِ تاریک چھا گئی
 جس دن سے آنکھ بند ہوئی آفتاب کی
 ظلمت میں جس کی نورِ سحر کا گزرنہ ہو
 حالت وہی ہے اب دلِ خانہ خراب کی
 پہلو میں دردِ قوم کا طوفان لیے ہوئے
 ڈوبی فنا کی موج میں کشتیِ حباب کی

شام و پگاہ آس کے امانت تھی دوش پر

محبوبِ قوم، سیدِ عالی جناب کی
کرتا تھا نیک و بد کا ہمیشہ محاسبہ

طفلی سے عادت آس کو رہی احتساب کی
حسرت بھری نگاہ وہ چشمِ پُر آب کی
یہ آخری کرن تھی میرے آفتاب کی

تن پر ہو آفتاب کے، یا رب! رداء نور

جنت کی جلوہ گاہ میں وہ خوفشاں رہے
چمکے یہ آفتاب نئے آسمان پر
اور گرد آس کے حلقہٴ سیارگان رہے
یہ کشتگانِ عشق ہیں، وہ طائرانِ قدس
برقِ فنا سے جن کا بلند آشیان رہے
گلزارِ آفتاب میں تا دور آفتاب

شمشاد و سرو و لالہ و گل کا سماں رہے
مائند آفتاب، یہ انجم ہوں جلوہ ریز
اور ان کی آب و تاب تیرا سماں رہے
لایا تھا کوہسار سے جس کو یہ کوہکن

وہ زندگی کا چشمہٴ شیریں رواں رہے
آس آفتاب نے رخِ انور چھپا لیا
ناظرِ شبِ فراق میں اب نوحہ خواں رہے

مرثیہ

گوہر علی مرحوم

میر گوہر علی مرحوم ساڈھورہ ضلع انبالہ کے سادات میں سے تھے اور ایف. اے. میں تعلیم پاتے تھے۔ آن کی بے ہنگام موت سے کالج پر آداسی چھا گئی۔ علی کڑھ کالج کی آبادی سے غالباً یہ پہلا جنازہ اٹھا تھا جس کو سب طلبہ نے بہت محسوس کیا۔

آج یہ مجمع احباب پریشاں کیوں ہے؟
آج ہر آنکھ میں اشکوں کا یہ طوفان کیوں ہے؟
چھا گئی آج یہ محفل پہ آداسی کیسی؟
آج افسردہ دل، اے مجلس اخوان! کیوں ہے؟
کھو دیا آج وہ یار چمن آرا تم نے
اس کو اک گورِ غریباں میں اتارا تم نے

ہائے! کیا ظلم کیا بادِ خزانہ تو نے
چھوڑی اس گل کی نہ گلشن میں نشانی تو نے
بزمِ ملت میں ہے آج ایک جوان کا ماتم
ہائے! کیا قہر کیا مرگِ جوانی تو نے
وائے قسمت! کہ فرشتوں نے یہ گھر دیکھ لیا
اور سادات کا یہ نورِ نظر دیکھ لیا

فرصتِ دید بھی، ہیبت! نہ ہونے پائی
وقتِ رخصت بھی ملاقات نہ ہونے پائی

سرسیم

خان بہادر میاں سر فضل حسین مرحوم

میاں صاحب مرحوم سے میرے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ جب آن کے انتقال کی خبر مجھے پہنچی تو جذباتِ غم کا دل پر ہجوم ہو گیا اور بغیر غائر فکر سخن کے یہ نالہ منقولہ میں نے تعزیت نامہ کے ساتھ میاں نسیم حسین صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم میاں صاحب مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔ آمین!

آہ! سر فضل کارواں نہ رہا قوم کا میرے کارواں نہ رہا
جس کے ماتم میں سرنگوں ہیں علم اوجِ عزت کا وہ نشان نہ رہا
وہ حکومت کا معتمد نہ رہا وہ رعیت کا رازداں نہ رہا
قالبِ قوم کا وہ روح و رواں جسمِ ملت کا جانِ جان نہ رہا
شہرہ شہر و افتخارِ دیار مایہ نیازِ خاندان نہ رہا
وقت پر ہوگا کون سینہ سپر ملک و ملت کا پاسباں نہ رہا
ملتوں کے مٹاپ کا شیدا وہ دماغ و دلِ تپاں نہ رہا
بتکدے میں جو تھا دلیلِ حرم وہ بتوں کا مزاجداں نہ رہا
الوداع، اے خیال و خوابِ عروج! بامِ رفعت کا نردباں نہ رہا
چرخِ رفعت کا تھا جو سیارہ اب زمیں پر وہ خوفشاں نہ رہا
اب وہ روشن چراغِ بزمِ وطن تجھ میں، اے تیرمخاکداں! نہ رہا
مطلعِ قوم ہو گیا تاریک وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
رو رہی ہے وہ یونین کی برات جس کا نوشاہِ درمیاں نہ رہا
بزمِ ملت میں جائیں کس دل سے
زبِ محفل وہ جانِ جان نہ رہا

ہائے ! وہ جان نواز غمزہ لطف اور تبسم وہ دلستان نہ رہا
گو خطابوں سے سر بلند ہوا مٹے نخوت سے سرگراں نہ رہا
وقفِ آلام و تارکِ لذات عیشِ فانی سے شادمان نہ رہا
وہ دلِ بے قرار و عزمِ بلند ناتوانی میں ناتوان نہ رہا
جان دے دی وطن کی خدمت میں اب کوئی اور امتحاں نہ رہا
جب ہوا غلّی سعی بار آور باغِ ہستی میں باغباں نہ رہا
اور ارمانِ ستم کا دل میں ترے اب تو، اے دورِ آہاں ! نہ رہا
سچ بتا تو ہی، اے نسیمِ چمن ! کیا وہ اب سروِ بوستان نہ رہا
کاش کچھ دن تو اور رہ جاتا نہ رہا پھر مرا میاں نہ رہا
اب تو رضوان ہے اور مقامِ رضا فکرِ سود و غمِ زیاں نہ رہا
کیا رہا لطفِ شعر میں ناظر
اب کہ سرِ فضلِ نکتہ داں نہ رہا

ہر قلم

نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سرسید راس مسعود مرحوم

آہ مسعود ! ترے ہجر میں دل ڈوب گیا
اور مرے دیدہ گریاں میں آجلا نہ رہا
میرے گلشن کی خرابی کا کچھ احوال نہ پوچھ
جس میں وہ سروِ رواں ، وہ قدِ بالا نہ رہا
نہ رہا نجد میں کوئی سروِ سامانِ جنوں
اب وہ ناقہ نہ رہا ، محملِ لیلی نہ رہا

ہائے! وہ قوم کا محبوب، وہ پیارا مسعود
 ناظرِ غمزدہ کا چاہنے والا نہ رہا
 دودہ احمد و محمود کا وہ چشم و چراغ
 سید قوم کا وہ نازوں کا پالا نہ رہا

سرنگوں آج ہیں ماتم میں ترے سرو و سمن
 اپنے گشن میں پھر، اے سروِ خراماں! آ جا
 جھومتے تیرے ترانوں پہ، تھے مرغانِ چمن
 پھر اسی بزمِ گلستان میں غزل خواں آ جا
 تجھ کو روقی ہوئی ساون کی گھٹائیں آئیں
 ابرِ نیساں کی طرح سوءِ گلستان آ جا
 رخِ پرنور سے کاشانہ منور کر دے
 شبِ تاریک میں، اے شمعِ شبستان! آ جا
 قدرِ جوہر کی تو غربت ہی میں ہوتی ہے مگر
 تو بدخشاں ہی میں، اے لعلِ بدخشاں! آ جا
 مادرِ غمزدہ کا گریہ، یعقوب تو دیکھ
 مصرِ بھوپال سے پھر جانبِ کنعان آ جا
 آ رہی ہے حرمِ کعبہ سے آوازِ خلیلؑ
 اے مرے لختِ جگر! میں ترے قرباں، آ جا

آنکھ سید کے جو گلزار میں کھولی تو نے
 چشمِ ناظر نے تجھے، اے گلِ خنداں! دیکھا
 کبھی دادا نے دیا بوسہ جبین پر تیری
 باپ کا لب کبھی رخسار سے چسپاں دیکھا

تیری خُردی میں ہی آثارِ بزرگی دیکھے
 ماتھے پر اخترِ اقبال درخشاں دیکھا
 جس چمن کو ترے دادا کے لہو نے سینچا
 اُس گلستان میں تجھے مرغِ خوش الحان دیکھا
 جس ستارے کا ہوا مطلعِ مشرق سے طلوع
 اس کو مغرب کے آفاق پر بھی درخشاں دیکھا
 گو بہت قلمِ مغرب میں سفینے ڈوبے
 گنجِ گوہر سے زرافشاں ترا داماں دیکھا
 جب مع الخیر وطن میں ہوا تو جلوہ فروز
 ہر خریدار نے یوسف بہت ارزاں دیکھا
 پھر وہ سلطانِ دکن، نیرِ رخشاںِ دکن
 شاہِ جمجاہ تری دید کا خواہاں دیکھا
 علم کے نور سے معمور ہوا ملکِ دکن
 قریہ قریہ میں قلمرو کے چراغاں دیکھا
 منصب و جاہِ دکن، لطفِ شہنشاہِ دکن
 آخر اک کاسہ دروزہ پہ قرباں دیکھا :

رنگ و بو قوم کے گلزار کو تو نے بخشی
 ابیر نیساں کو چمن پر گہرافشاں دیکھا
 تیرا مداح ہر استادِ معلّم پایا
 تیرا مشتاق ہر اک طفلِ دبستان دیکھا
 دلبرانہ ترا اندازِ تکلم پایا
 تیری ہر بات میں اک عشوہِ جاناں دیکھا

ملک شیدا ہوا سیرت کی بلندی کا تری

قوم نے دامِ محبت رخِ رخشاں دیکھا
بچ سکے لوٹ سے جس شوخ کی کعبہ نہ کنشت

ایسا کافر کوئی دیکھا ، نہ مسلمان دیکھا
بزمِ جانان میں مگر شورِ رقیباں سن کر

غیرتِ عشق سے عاشق کو گریزاں دیکھا
دل میں تھا سیلِ بلا کا ترے دھڑکا لیکن

موجِ طوفاں سے تجھے دست و گریباں دیکھا
ایک ناسور سا تو دل میں لیے پھرتا تھا

مثلِ گلِ گرچہ شگفتہ ترا عنوان دیکھا
آخر اس روحِ سبک سیر کا شوقِ پرواز

عرشِ اعظم کی فضاؤں میں پر افشاں دیکھا
شورِ شیون ہوا ہر کوچہ و برزن سے بلند

اور ہر سینہ کو غم سے ترے بریاں دیکھا
غم سے تھے تفتہ جگر گرچہ ترے نورِ نظر

تاجِ بھوپال کو دونوں کا نگہباں دیکھا
الوداع، اے مرے سو جان سے پیارے، مسعود

مرے پیارے، مرے اللہ کے پیارے ، مسعود
ہائے! کس دل سے چلیں سیرِ چمن کو ناظر

جب گلستاں میں نہیں اُس گلِ رعنا کی نمود
اس نے ویراں کیے گلزارِ تمنا کیا کیا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ستمِ چرخِ کبود
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ستمِ چرخِ کبود

تجھ کو مرغوب نہ تھی عالمِ بقی کی فضا
 اس لیے عالمِ بالا کو ہوا تیرا صعود
 جوشِ عشق سے مسعود کی یہ عقدہ کھلا
 کیوں کیا آدمِ خاکی کو ملائک نے سجود
 تو ہوا احمد و محمود کی خلوت کا انیس
 قابلِ دید ہے ، مسعود! تیری بزمِ شہود
 تجھ پر، اے سیدِ پاک! اور اب و جد پہ ترے
 تا ابد لاکھوں سلام اور ہزاروں ہوں درود
 باغِ رضواں میں اب آرام سے سو جا، پیارے!
 تیری میراثِ بدر ہے یہ مقامِ محمود

قطعہ تاریخ وفات

مولوی عبدالصمد

وائے حسرت آج رخصت ہو گئے
 ہو گئے فارغِ غم ایام سے
 تھا مرا ہمدم وہ یارِ زندہ دل
 یارِ شاطر تھا مرا شطرنج میں
 جدِ امجد اُس کے تھے باوا فرید
 عمر بھر تھا ماسوا سے بے نیاز
 کل جو پوچھے ناظرِ مہجور سے
 یارِ جانی ، مولوی عبدالصمد
 سو گئے آرام سے زیرِ لحد
 عالمِ طفلی سے لے کر تا لحد
 شعر میں تھی طبعِ حاضر کی مدد
 اُس کا ذوق و شوق تھا میراثِ جد
 حرزِ جاں تھا ”قل هو اللہ احد“
 دوستوں نے سالِ رحلت کے عدد
 فرطِ غم سے آہ بھر کر کہہ دیا

”داخلِ جنت ہوا عبدالصمد“

تاریخ وفات

شیخ محمد امین ولد شیخ محمد بخش، تاجر

ڈوبا ہے وہ صبح کا ستارا مہتاب کی جس میں تاب ہوتی
مرقد پہ لکھی ہے اس کے تاریخ کیا خاک میں مل گیا ہے موتی

سہرا

سہرا چودھری عنایت اللہ خاں و چودھری حبیب اللہ خاں

مبارک ہو تجھے، نوشاہ! یہ فرخ نشان سہرا

رہے یمن و سعادت کا ترے سر جاوداں سہرا

ترے شوقِ تعلّم نے وہ کی درسی فضا پیدا

کہ تیرے بن گیا رخ پر گلستان، بوستان سہرا

براقی ہیں ترے تعلیم کے رخشنده سیارے

ہے علم و فضل کا اک باتجمل کارواں سہرا

چمن میں دھوم ہے وہ تیرے قامت کی، درازی کی

لب جوگا رہے ہیں تیرا سب سروِ رواں سہرا

مثالِ برگِ گل دامن رہے پاکیزہ نوشہ کا

زبانِ حال سے یوں ہو رہا ہے گلشیاں سہرا

دلوں میں لازوالِ اخلاص کا پیوند محکم ہو

تو باغِ زندگی میں ہے بہارِ بے خزاں سہرا

ہوا پیوند نوشہ تیرا اس نامی گھرانے سے

کہ ہے عِز و شرف سے جس کے رنگیں دامنِ سہرا
 سمجھنا تم نہ اس سہرے کو رسمی محفل آرائی
 کہ ہے یہ جذبہ مہرِ پدر کا ترجاں سہرا
 اشارہ گرچہ ہے اس میں عنایت کی درازی کا
 ترا بھی اس میں شامل ہے* حبیب اللہ خان سہرا
 تمنا ہے یہ ناظر کی نسیمِ لطفِ یزداں سے
 کہ صدہا باغ و بستان کا بنے خود باغیاں سہرا

سہرا

ملک محمد اکرم خان شمس آبادی

اس برات میں بعض بزرگانِ دین شریک تھے۔ نوشہ کے ایما سے
 ارتجالاً یہ سہرا لکھا گیا۔

سرِ نوشاہ پر زیبا ہے کیا نامِ خدا سہرا
 مبارک ہو بنامِ پاکِ ختمِ الانبیاء* سہرا
 دماغ و دل کو مہکائے ہوئے ہے رنگ و بو جس کی
 سجا کر لائی گلزارِ تمنا سے صبا سہرا
 کہا مالن نے کیمل پور سے دیکھا کراچی تک
 نہ ایسا چاند ما مکھڑا، نہ ایسا چاند ما سہرا

*چودھری عنایت اللہ خان اور چودھری حبیب اللہ خان، فرزندانِ مصنف،
 کی شادی ایک ہی وقت میں ہوئی اور دونوں کے لیے ایک ہی سہرا
 لکھا گیا۔

جییں ہر جلوہ ریزی ہے تری نورِ سعادت کی
 کہ جس کو دیکھ کر پڑھنے لگا "صلیٰ علی" سہرا
 ترے سہرے سے بوع گشتِ اسلام آتی ہے
 نہ ہو کیوں دیدۂ دیندار میں یہ دلربا سہرا
 مبارک ہے وہ نوشہ سر پہ جس کے باپ دادا کے
 خلیلؑ اللہ کی مہاں نوازی کا رہا سہرا
 ضیاءِ مہر سے ہو شاہراہِ عمر نورانی
 سفر میں زندگانی کے ہو نجمِ رہنا سہرا
 اسی رشتہ سے ہے شیرازہ بندی نوعِ انساں کی
 ہے پیمانِ ازل پر مہرِ اخلاص و وفا سہرا
 حصارِ عافیت تیرے لیے ہو لطفِ ربانی
 ہو سر پر ظلیٰ سبحانی ترے صبح و مسا سہرا
 دمِ رخصت رخِ ناظر پہ اشکوں نے جھڑی باندھی
 جب اک نورِ نظر* کو اس کے لیے کر چل دیا سہرا

سہرا

سید سعادت علی شاہ، پروفیسر، گورنمنٹ کالج، لائلپور

سید صاحب کے خاندان سے میرے چھل سالہ مخلصانہ و دوستانہ تعلقات
 اس سہرے کی تصنیف کا باعث ہوئے۔

مبارک ہو یہ نکہت بار سہرا یہ خوبی کا گلی گزار سہرا
 سیادت اور سعادت کا مرقع مبارک ہو سعادت یار سہرا

* دخترِ مصنف

وہ چشمِ مست پر لہرا رہا ہے ہے دو مستوں میں اک ہشیار سہرا
 ہیں اس میں گشتِ کشمیر کے بھول نہ ہو کیوں جنتِ دیدار سہرا
 عزیزِ خاطرِ شیخ و برہمن انیسِ سبوحہ و زئار سہرا
 زبانِ حال سے سب گ رہے ہیں یہ کالج کے در و دیوار سہرا
 ہے دو جسموں میں یک جانی کا رشتہ ہے دونوں کے گلے کا بار سہرا
 وہ دل کی راہ دل میں کرنے والا ہے دامنِ خیالِ یار سہرا
 ہے شرحِ آیتِ "انتم لباس" ہے ننگ و نام کا ستار سہرا
 مبارک ہو، بنامِ ایزدِ پاک طفیلِ احمدی مختار سہرا
 ہے ناظر کی نظر میں، چشمِ بد دور
 طلوعِ طالعِ بیدار سہرا

مناظرِ قدرت

چہار موسم

یہ انعامی نظم عہد طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس مجموعہ میں پوری نظم کا شائع کرنا موجب طوالت ہوتا۔ نیز مولانا کامل اور بعض دیگر احباب ماہر تعلیمات کا خیال ہے کہ یہ نظم ابتدائی اور ثانوی درجہ کے طلبہ کے لیے بہت موزوں ہوگی اور اس کا علیحدہ طبع کرانا مناسب ہوگا۔ لہذا ناظرین مجموعہ ہذا کی دلچسپی کے لیے اس نظم کے بعض منتخب حصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

بہار

دشت و گلزار میں بہار آئی عطر ییز آئی، مشکبار آئی

باغ کے طائر آشیانوں میں محو ہیں عیش کے ترانوں میں
 فرحت انگیز ہے شمعِ بہار اور گلریز ہے نسیمِ بہار
 پھول کھیتوں میں، صحنِ باغ میں پھول پھول جنگل میں، باغ و راغ میں پھول
 دشت میں پھول، کوہسار میں پھول مرغزار اور لالہ زار میں پھول
 پھول گہن میں، شاخسار میں پھول پھول سبزہ میں، جوئبار میں پھول
 گلِ رخوں کی ہیں پھول جھولی میں پھول دامن میں، پھول چولی میں
 کان میں گوشوار پھولوں کے اور گلے میں ہار ہیں پھولوں کے
 پھول میزوں پہ، پھولدانوں میں پھول زلفوں میں، پھول شانوں میں
 ہے چمن میں شگوفہ رنگا رنگ کوئی گہرا ہے کوئی ہلکا رنگ
 سرخ، زرد اور نیلے پیلے ہیں ان میں ہر رنگ کے رنگیلے ہیں
 سبز شاخیں چنور ہیں پھولوں کے سبز پریاں ہیں، پر ہیں پھولوں کے
 ہے کسی گل کا زعفرانی رنگ اور کسی کا ہے آسمانی رنگ
 اوس سے سبزہ کی زباں تر ہے سر پہ اک موتیوں کی جھال رہے
 اس میں چکر لگا گئی ہے ہوا رات موتی لٹا گئی ہے ہوا
 فرشِ مخمل ہے مرغزاروں میں لالہ و گل ہے کوہساروں میں
 گھاٹیوں میں بسنت پھولی ہے وادیوں کی گلابی چولی ہے
 گل کو گلچین سے یاں ہر اس نہیں اور کوئی گل فروش پاس نہیں
 آنکلتا ہے کوئی بنِ بلسی یا کوئی جوگی اور سناسی
 دیکھ لی سیرِ گلشن و کہسار ناظر، اب چھوڑو داستانِ بہار
 کچھ ہوا گرم گرم آئی ہے گل و بلبل میں اب جدائی ہے

الوداع، اے عروسِ رعنائی !

”سلامت روی و باز آئی“

گرما

سورج اب پیترا بدلتا ہے سوء نصف النہار چلتا ہے
 آس کے چہرے پہ اب تمازت ہے آس کے غمزوں میں اب حرارت ہے
 کوہ و صحرا کا رنگ اور ہوا بزمِ گلشن کا ڈھنگ اور ہوا
 لالہ و گل کی چھن گئی وردی سبز پتوں پہ چھا گئی زردی
 دھوپ میں ہے وہ آتش افشانی جس سے خونِ بدن ہوا پانی
 اس طرف ڈالیے آفتابِ نظر آس پہ آندھی کا چھا گیا لشکر
 آگئے فوج کے علم بردار خس و خاشاک اور گرد و غبار
 لو وہ دم بھر میں آڑ گئے یک لخت جھونپڑے، گھاس پھوس، کھیت، درخت
 نہ رہا آسمان کا رنگِ کبود اب تو صورت ہوئی غبارِ آلود
 اس طرف دیکھیے بگولا ہے خس و خاشاک کا ہیولا ہے
 حال پتلا ہے اب پرندوں کا قافیہ تنگ ہے چرندوں کا
 اب ہرن چو کڑی نہیں بھرتا اور وہ اٹھکھیلیاں نہیں کرتا
 گیدڑ اب کچھ آداس بیٹھا ہے بھیڑیا بدحواس بیٹھا ہے
 شیر بھی اب دباڑنا بھولا اپنی بستی آجاڑنا بھولا
 سب وہ خوشخوار، بن کے باشندے بانپ کر جھاڑیوں میں لیٹ رہے
 اب کوئی دن میں ابرِ نیسانی آن کو آ کر پلائے گا پانی
 دل جلوں کی لگی بجھا دے گا
 آجڑی بستی کو پھر بسا دے گا

برسات

لو گھٹا وہ آفتاب چھانے لگی بجلی چھپ چھپ کے مسکرانے لگی

رنگ لائی ہے کیا رنگیلی گھٹا
 کالی کالی وہ نیلی نیلی گھٹا
 جھومتی، لڑکھڑاتی آتی ہے
 ابر کی آسماں پہ موج آتی
 بڑھتے جاتے ہیں ہر طرف بادل
 برق کا تازبانہ آ پہنچا
 اندھیوں کا آلٹ گیا دفتر
 لو وہ آبِ حیات آ پہنچا
 آسماں پر ہیں چھا رہے بادل
 پانی چشموں میں، آبشاروں میں
 پانی کھیتوں میں، پانی گشن میں
 اب درختوں کا دلربا ہے نکھار
 دشت و کہسار کا ہے آجلا رنگ
 آؤ! دریا کی دیکھیں طغیانی
 کوہساروں میں جب یہ چلتے ہیں
 آن کی موجوں کا زور ہوتا ہے
 یاں شناور شنآوری بھولے
 آبِ دریا کو روک تھام نہیں
 یاں نہ انجینیئر کی حاجت ہے
 اپنے گھر کا ہے آپ ہی معیار
 کوہ و صحرا کو کاٹ لیتا ہے
 سینکڑوں منزلوں سے آتا ہے
 ٹکریں پتھروں سے کھاتا ہے
 سچ کے آئی نئی نویلی گھٹا
 آودی آودی وہ پیلی پیلی گھٹا
 رنگ رلیاں مناتی آتی ہے
 یا کوئی ہاتھیوں کی فوج آتی
 آج ان کا ہے آسماں پہ عمل
 رعد کا تو پخانہ آ پہنچا
 اور بگولوں کے تھم گئے چکر
 ساقی! کائنات آ پہنچا
 اور زمیں پر ہے ہر طرف جل تھل
 پانی نالوں میں، رودباروں میں
 پانی چھت پر ہے، پانی آنگن میں
 دھل گیا چہرہ گل و گلزار
 آسماں و زمیں نے بدلا رنگ
 ندی نالے ہیں آج طوفانی
 آن کی بیت سے دل دہلتے ہیں
 آبشاروں کا شور ہوتا ہے
 ناخدا ناخدا گری بھولے
 توسن موج کو لگام نہیں
 نہ کسی راہبر کی حاجت ہے
 جانتا ہے چڑھاؤ اور آثار
 اور چٹانوں کو چاٹ لیتا ہے
 دم بدم پیچ و تاب کھاتا ہے
 شور کرتا ہے، دندناتا ہے

رنگ لائی ہے کیا رنگیلی گھٹا
 کالی کالی وہ نیلی نیلی گھٹا
 جھومتی، لڑکھڑاتی آتی ہے
 ابر کی آسماں پہ موج آتی
 بڑھتے جاتے ہیں ہر طرف بادل
 برق کا تازیانہ آ پہنچا
 آندھیوں کا آٹ گیا دفتر
 لو وہ آپ حیات آ پہنچا
 آسماں پر ہیں چھا رہے بادل
 پانی چشموں میں، آبشاروں میں
 پانی کھیتوں میں، پانی کشن میں
 اب درختوں کا دلربا ہے نکھار
 دشت و کہسار کا ہے آجلا رنگ
 آؤ! دریا کی دیکھیں طغیانی
 کوہساروں میں جب یہ چلتے ہیں
 آن کی موجوں کا زور ہوتا ہے
 یاں شناور شنآوری بھولے
 آب دریا کو روک تھام نہیں
 یاں نہ انجینیئر کی حاجت ہے
 اپنے گھر کا ہے آپ ہی معمار
 کوہ و صحرا کو کاٹ لیتا ہے
 سینکڑوں منزلوں سے آتا ہے
 ٹکریں پتھروں سے کھاتا ہے
 سچ کے آتی نئی نویلی گھٹا
 آودی آودی وہ پیلی پیلی گھٹا
 رنگ رلیاں مناتی آتی ہے
 یا کوئی ہاتھیوں کی فوج آتی
 آج ان کا ہے آسماں پہ عمل
 رعد کا تو پخانہ آ پہنچا
 اور بگولوں کے تھم گئے چکر
 ساقی! کائنات آ پہنچا
 اور زمیں پر ہے ہر طرف جل تھل
 پانی نالوں میں، رودباروں میں
 پانی چھت پر ہے، پانی آنگن میں
 دھل گیا چہرہ گل و گلزار
 آسماں و زمیں نے بدلا رنگ
 ندی نالے ہیں آج طوفانی
 آن کی ہیبت سے دل دہلتے ہیں
 آبشاروں کا شور ہوتا ہے
 ناخدا ناخدا گری بھولے
 توسن موج کو لگام نہیں
 نہ کسی راہبر کی حاجت ہے
 جانتا ہے چڑھاؤ اور آتار
 اور چٹانوں کو چاٹ لیتا ہے
 دم بدم پیچ و تاب کھاتا ہے
 شور کرتا ہے، دندناتا ہے

گھاٹیوں میں کبھی گرجتا ہے وادیوں سے کبھی الجھتا ہے
 بستیوں کو گرا کے خاک کرے ڈھور ڈنگر کو بھی ہلاک کرے
 کبھی میدان میں پھیل جاتا ہے اور نئی بستیاں بساتا ہے
 یونہی منزل تمام کرتا ہے آپ ہی اپنا کام کرتا ہے
 حق تو یہ ہے کہ قدرتی منظر کچھ عجب دل پہ ڈالتے ہیں اثر
 جب یہ اپنی فضا دکھاتے ہیں آدمی کو خدا دکھاتے ہیں
 ناظر خفته را کند بیدار
 نغمہ جو و سبزہ کہسار

سرما

بزم گلشن کے رنگ دیکھ لیے ابر نیساں کے ڈھنگ دیکھ لیے
 سیر سرما تمہیں دکھاتے ہیں آخری پردہ اب اٹھاتے ہیں
 اب نہیں ہے وہ کڑ کڑاتی دھوپ بلکہ اب تو ہے دل کو بھاتی دھوپ
 آگ سے سب ہیں لو لگانے لگے اور پانی سے جی چرانے لگے
 سچ تو یہ ہے زندگی کا مزا کوئی دن سردیوں میں ہی دیکھنا
 نوجوان بن سنور کے چلتے ہیں سوٹ بوٹ اب نئے بدلتے ہیں
 اب تجارت کا گرم ہے بازار اور عدالت میں بھی ہے کثرت کار
 لکھنے والے ہیں خوش اہیلوں کے اور دن پھر چلے وکیلوں کے
 سرحدوں پر ہے چھیڑ چھاڑ شروع رجمٹوں میں ہوا بگاڑ شروع
 ہوسٹل، کالج اور سب اسکول رات دن ہیں رنٹ میں مشغول
 کوہ و صحرا میں آرہے ہیں نظر اب زمستان کے قدرتی منظر
 صبحدم یخ کا ہے وہ نظارا سیمگوں فرش خاک ہے سارا

برف گرتی ہے کوہساروں پر جن میں مشکل ہے آدمی کا گزر
 چوٹیوں پر ہے نور کا عالم یا تجلیٰ طور کا عالم
 برف کا بھی عجب ہے نظارا برف پوش اب ہے گشن و صحرا
 ہیں درختوں کے جھنڈ برفانی اور سب ٹنڈ منڈ برفانی
 برف پھولوں پہ، شاخسار پہ، برف چشموں پہ، آبشار پہ، برف
 بن میں دیکھو وہ برف پوش اشجار خضر کے سر پہ، نور کی دستار
 برف کوچوں میں، برف گلیوں میں برف بچوں کی رنگ رلیوں میں
 برف کے بت ہیں، برف کے مندر برف باہر ہے اور برف اندر
 مختلف گو یہ صورتیں ہیں تمام ایک صورت کی مورتیں ہیں تمام
 غور سے آن کو دیکھئے گا اگر سب یہ پانی کا ہے فریب نظر
 برف بن کر گرا پہاڑوں میں سر پٹکتا رہا دراڑوں میں
 خاک چھانی کبھی بیاباں کی اور کبھی سیر دیکھی میداں کی
 کبھی نالوں سے پھوٹ کر نکلا کبھی چشموں سے چھوٹ کر نکلا
 کبھی شبنم، کبھی بخار ہوا بادلوں میں کبھی سوار ہوا
 کبھی موقی نثار کرتا ہے کبھی اولوں کی مار کرتا ہے
 دست صانع ہے شاہکاروں میں
 کہو گیا ناظر ان نظاروں میں

خاتمہ

ہو چکا حال موسموں کا بیان ختم ہے قصہ بہار و خزاں
 ناظر اب ماتم بہار نہ کر دل کو اس غم سے داغدار نہ کر

گرچہ بدنام ہے جہاں میں خزاں باغِ ہستی کی ہے یہ روح و رواں
 گود میں اس کی پل رہی ہے بہار نیا چولا ہے ، بدل رہی ہے بہار
 تا ابد ہے خزاں بہار کے ساتھ جیسے گل ہے چمن میں خار کے ساتھ
 تم بھی، اے نونہالِ باغِ وطن! شمعِ محفل رہو ، چراغِ وطن
 تم بھی یاروں کے یار ہو کے رہو اور خزاں میں بہار ہو کے رہو
 جب تک اس باغِ دہر میں تم ہو غنچہ ساں ، زیرِ لب تبسم ہو
 دل کو کرنا نہ وقفِ ریخ و یمن یہ چمن ہو سدا بہار چمن
 مثلِ گل ، باغِ باغ ہو کے رہو محفلوں کے چراغ ہو کے رہو
 دل پہ غم کا غبار چھانے نہ پائے اور چتون پہ میل آنے نہ پائے
 ہو فراغت کہ تنگدستی ہو طبعِ روشن چراغِ ہستی ہو
 گو جوانی بہت ”دوانی“ ہے پر یہی عطرِ زندگی ہے
 رائگاں یہ شباب جانے نہ پائے دل کی یہ آب و تاب جانے نہ پائے
 نوجوانی میں زندگی ہے
 ورنہ باقی تو عمرِ فانی ہے

میدانِ چنگ تھنگ

یہ مرتفع میدان لاسہ اور لداخ کے مابین واقع ہے اور سوائے وسیع
 سبزہ زاروں کے کوئی چیز اس میں نظر نہیں آتی ۔

آگئے ایسی جگہ ناظرِ جہاں کوئی نہیں
 گردِ رہ کوئی نہیں اور کارواں کوئی نہیں

ہم سفر اپنا بجز آبِ رواں کوئی نہیں
 ہم نفس ، ہمدم بجز بادِ وزاں کوئی نہیں
 شورِ ناقوس اور آوازِ اذان کوئی نہیں
 تفرقہ شیخ و برہمن کا یہاں کوئی نہیں
 زیرِ پا جز صندلیں فرشِ زمیں کچھ بھی نہیں
 اور سر پر سائبان جز آسمان کوئی نہیں
 گل نہیں ، بلبل نہیں ، نسریں نہیں ، سنبل نہیں
 مرغِ خوشخوار کا چمن میں اشیان کوئی نہیں
 جز شبانوں کے نہیں اس دشت کا کوئی مکین
 اور غاروں کے سوا ان کا مکان کوئی نہیں
 کارزارِ اہلِ دنیا سے یہاں ہے امنِ عام
 زخمِ دل کوئی نہیں ، تیغِ زباں کوئی نہیں
 ایک روحانی تموج ہے ہوا میں ہر طرف
 صرصرِ حرص و ہوا کا یاں نشان کوئی نہیں
 کار و بارِ شوق ہے نے گیرو دارِ حسن و عشق
 جذبہ ہاءِ دل کو خوفِ امتحان کوئی نہیں
 کوہساروں سے عیار ہے سطوتِ صنعِ ازل
 حضرتِ انسان کی صنعت کا نشان کوئی نہیں
 ہو گا عالم ہر طرف اور ہا و ہوسب ہر طرف
 اے جبینِ عجز ! ایسا آستان کوئی نہیں
 ناظرِ آنکھیں بند کر کے اب خدا کو یاد کر
 تیرے چشم و گوش کا مصرف یہاں کوئی نہیں

شمشاد کشمیر

سری نگر کشمیر میں وزیر پُنتوں کی یادگار ، وزیر باغ ، میں عرصہ تک
میرا قیام رہا . یہ وسیع رقبہ سفیدے کے درختوں اور گلاب کی بیلوں
سے محدود تھا اور صبح و شام کی تنہا خراسی میں ان سے راز و نیاز
کا معاملہ رہتا تھا .

صبح دم آئی گلستان سے نسیم مشکبار
کر رہا تھا مدتوں سے جس کا ناظر انتظار
سبزہ و گل کی چمن میں تھیں وہ رنگ آرائیاں
کر رہی تھی فرشِ مخمل پر صبا نقش و نگار
قابلِ نظارہ تھا وہ جلوۂ باغِ وزیر
گل چمن اندر چمن ، سبزہ بہار اندر بہار
ہر طرف صحنِ چمن میں پھول والوں کی تھی سیر
گل بکف تھے ناشپاتی ، سیب و رمان و انار
ان کے یوں دامن سے لپٹے تھے گلاب و یاسمن
جس طرح گل پیرہن پہنے کوئی پھولوں کا ہار
لب بہ لب ، ساعد بہ ساعد اور کنار اندر کنار
مل رہے تھے چار یاروں کی طرح چاروں چنار
چار سو بزمِ چمن میں ، چوہداروں کی طرح
اک تجمل سے صف آرا تھی سفیدوں کی قطار
اک سفیدہ ان میں تھا جو سربلند و سرفراز
مدتوں دیکھا تھا جس نے گرم و سردِ روزگار

یوں ہوا گویا کہ میں ہوں قوم کا قائم مقام
 لیڈری کا اس جماعت کی ہے مجھ کو افتخار
 حضرتِ ناظر سے نسبت خاص ہے اس قوم کو
 اس لیے ہیں آپ کے ہم پاسبان و پاسدار
 راستی ہر بات میں اپنا ہے دستور العمل
 اس پہ ہیں ثابت قدم شام و سحر ، لیل و نہار
 آج اہل دل سے اپنی داستان کہتے ہیں ہم
 ناظرِ رنگیں نوا کو راز داں کہتے ہیں ہم

راست رو ہیں رسم و راہ راستان رکھتے ہیں ہم
 سرو قد ہیں شیوہ آزادگان رکھتے ہیں ہم
 اپنے دم سے ہے بہارِ جوئبار و سبزہ زار
 سر پہ، باغ و راغ کے چتر و نشان رکھتے ہیں ہم
 ڈھانک لیتے اپنی شاخوں سے ہیں دیوارِ چمن
 چشمِ گلچیں سے جہاں گل نہاں رکھتے ہیں ہم
 دیکھ کر بزمِ چمن میں حسن کا بازار گرم
 غنچہ و گل سے الگ اپنی دکان رکھتے ہیں ہم
 زاہدانِ خشک ہیں دامن کو تر کرتے نہیں
 گو مکان اپنا لبِ جوع رواں رکھتے ہیں ہم
 سر بلندی سے نہیں آتا کبھی سر میں غرور
 سر براہِ خاکسارانِ جہاں رکھتے ہیں ہم
 بزمِ گلشن میں تہی جیب و تہی دامن رہے
 گرچہ، زیرِ پا حریر و پرنیاں رکھتے ہیں ہم

درد مندوں کی صدا اہل زمین سنتے نہیں
 اپنے چشم و گوش سوء آسماں رکھتے ہیں ہم
 خم نہیں ہوتی ہے ضعف و ناتوانی سے کمر
 موسم پیری میں بھی ہمت جواں رکھتے ہیں ہم
 خانہ بربادی گلشن کا تماشا دیکھ کر
 دوش پر اپنا ہمیشہ آشیاں رکھتے ہیں ہم
 ہاں، شنو از گوشہ گیرانِ جہاں، اے یارا! پند
 گوشِ اہل ہوش گیرد از در و دیوار پند

باغ ہستی میں رہو جب تک چمن پیرا رہو
 نخلِ طوبیٰ کی طرح، گلشن کے بزم آرا رہو
 گردِ راہِ کارواں سے میل چتون پر نہ آئے
 ہمکنارِ موجِ مثلِ ساحلِ دریا رہو
 منزلِ ہستی میں ہیں بس رہو گم کردہ راہ
 مثلِ نجمِ رہنا، ہموارہ رہ پیرا رہو
 گلشنِ عالم میں سب کے درمیاں، سب سے الگ
 باہمہ اور بے ہمہ مل کر رہو، تنہا رہو
 شاہراہِ صدق پر جم کر رہو ثابت قدم
 ہو ہوا پچھوا کہ پروا، اس سے بے پروا رہو
 دار و گیرِ عالمِ سفلی سے ہو آونچی نظر
 گوشِ بر راہِ سرودِ عالمِ بالا رہو
 دیکھ کر مسافرِ بدستِ لالہ بزمِ باغ میں
 یادِ مستورِ ازل میں مستِ ے صہبا رہو

عالمِ کثرت میں ، انگشتِ شہادت کی طرح
 رہنا سوءِ حریمِ خالقِ یکتا رہو
 نیند سے جاگے نہ ہوں جب خوشنویانِ چمن
 تم نسیمِ صبح کے نغموں سے بزمِ آرا رہو
 سبزِ خوابیدہ جاگے گا تمہاری چھاؤں میں
 سائبانِ بن کر تم آس کے سر پہ پا بر جا رہو
 کہہ رہے ہیں سبز پوشانِ چمن کشمیر میں
 تا صد و سی سالِ ناظرِ حاکمِ اعلیٰ رہو
 بر توکلِ دانہ در کشتِ املِ کاریم ما
 آرزوِ خرمن از ابرِ کرمِ داریم ما

چنار

نخلِ چنارِ جہالیاتِ کشمیر کا سب سے بڑا علم بردار ہے ۔ اس کی شان میں
 میری ایک نظم رسالہ ”شبابِ اردو“ میں غالباً ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی
 تھی مگر افسوس ہے کہ یہ نظم محفوظ نہ رہی اور اب نایاب ہے ۔
 چونکہ جہالیاتِ کشمیر کے اس مجموعہ کا چنار کی تصویر سے خالی رہنا
 مجھے گوارا نہ تھا ، لہذا اسی زمین اور اسی رنگ میں چنار پر دوسری
 دفعہ ذیل کی نظم لکھی گئی ۔

قسمت پہ اپنی مجھ کو اگر اختیار ہوتا
 میں گلشنِ جہاں میں نخلِ چنار ہوتا
 ریحاں میں ، یاسمن میں ، نسریں میں ، نسترن میں
 میں خیمہ زن چمن میں لیل و نہار ہوتا

شاخِ گلاب مجھ سے گلشن میں یوں لپٹی
 گردن میں میری گویا پھولوں کا بار ہوتا
 محفل میں میری ہوتا جب سبزہ فرش گستر
 پھولوں کا اس پہ رنگیں نقش و نگار ہوتا
 ہر برگ میرا ہوتا بزمِ چمن کا ساغر
 جب فصلِ گل میں ساقی ابرِ بہار ہوتا
 ہر شب مرے سرہانے مستِ مئے ترنم
 اک جوہار ہوتا یا آبشار ہوتا
 جب صبح آنکھ کھلتی مرغانِ خوش نوا کی
 ہر شاخسار میرا اک نغمہ زار ہوتا
 بزمِ مہی قداں میں میں سر بلند رہتا
 صنعت گرِ ازل کا اک شاہکار ہوتا
 اعیانِ بزم ہوتے گل پیرہن چمن کے
 اور شہرِ گلرخاں کا میں شہریار ہوتا
 میری جلو میں ہوتے صف بستہ سرو و شمشاد
 یہ پاسبان ہوتا، وہ چوب دار ہوتا
 آمد پہ فصلِ گل کی ٹخیم مرا چمن میں
 باغِ نشاط ہوتا یا شالامار ہوتا
 گلبرگ سے آترتیں سرخ اور سفید پریاں
 اندر کا بھی اکھاڑہ جن پر نثار ہوتا
 جب آتشیں رخیوں سے برقِ جہاں گرتی
 یہ شالامار اس سے اک شعلہ زار ہوتا

گل چہرہ مطربوں کی رنگیں نوائیوں سے

مستِ نوا چمن میں ہر ہوشیار ہوتا
خرمن سے عاشقوں کے شعلے بلند ہوتے

اور حسن کی نظر میں برق و شرار ہوتا
جب دیکھتا جہاں کے یہ دلربا نظارے
حسنِ ازل کا مجھ پر راز آشکار ہوتا

میری جبین پہ لکھتے دیرینہ داستانیں
پیشینہ صحبتوں کی میں یادگار ہوتا
آفاتِ آسانی سب اپنے سر پہ سہتا

سرو و سمن کے سر پر میں سایہ دار ہوتا
چھاؤں میں میری سوتا ہارا تھکا جو دہقان

اُس بے قرار کو بھی دم بھر قرار ہوتا
سیلِ بلا میں ہوتا میں کشتیوں کا لنگر

بے خانماں کے سر پر سنگیں حصار ہوتا
پیری میں میری ہوتا اک رنگِ نوجوانی

فصلِ خزاں بھی میرا رشکِ بہار ہوتا
خلوتِ کدے میں اپنے مستِ سرود رہتا

ہر شاخ و برگ میرا طنبور و تار ہوتا
صدیاں گزرتی جاتیں، دنیا بدلتی رہتی

وضعِ کہن پہ ناظر میں استوار ہوتا

متفرقات

نذرِ عقیدت

بجناب علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ، فرمانرواء بھوپال مسلم یونیورسٹی کے پہلے کانووکیشن کے جلسہ میں علیا حضرت کی عالمانہ و ماہرانہ تقریر سنکر اور باوجود ضعف پیری و ناسازی طبع آپ کا انہماک قومی خدمات میں دیکھ کر تمام حاضرین نہایت متاثر ہوئے۔ شام کو گارڈن پارٹی میں ہر ہائی نس نے الطاف خاص سے مجھ کو یاد فرمایا۔ مگر میں یونیورسٹی کی حدود میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لیے سعادت قدمبوس سے محروم رہا۔ انہی خیالات کے زیر اثر ذیل کے چند اشعار لکھے گئے۔

تا جہاں را جلوہ خورشید نورانی کند

تا عروسِ شب ہرندِ خویش ظلمانی کند

تا شعاعِ مہر، بہرِ زینتِ تاج و سریر

ہارِ ہاءِ سنگ را لعلِ بدخشانی کند

تا چمن را گستراند فرشِ گل بادِ صبا

تا دمن را جلوہ گہِ سبع الوانی کند

غنچہ را تا خاطرِ مجموع باشد در چمن

تا بہ گلشنِ گیسو سنبیل پریشانی کند

در بہارِ بوستان تا شاہِ گل با تاج زر

جلوہ آرائی بر اورنگِ گلستانی کند

تا خداوندِ دو عالم، از پئے نظمِ جہاں

شاہِ عادل را بہ گیتی ظلِ سبحانی کند

تیرِ اقبالِ سلطانِ جهان تابنده باد
 پرتوِ جاهش فلک را دیده نورانی کند
 با لواءِ کامرانی در سبّاء عیش و ناز
 تا ابد بقلیسِ اقبالش سلیمانی کند
 من نمی گویم سکندر آئنه بردارِ اوست
 یا که دارا بر درِ والاش درباری کند
 بر نمی آید مگر از دستِ شاهانِ کارها
 کالِ ضمیرِ روشن و ایثارِ سلطانی کند
 بارگاهش باد دائم سجده گاهِ قدسیان
 زانکه از تعلیمِ دینِ تنویرِ روحانی کند
 آنکه قومِ خویش را از علم داد آبِ حیات
 خالقِ قیوم عمرِ خضرش ارزانی کند
 حافظش بادا چو قرآن حفظِ ربانی مدام
 زانکه چندین سعی در تعلیمِ قرآنی کند
 آستانش همچو کعبه قباء ابرار باد
 زانکه بر رسمِ خلیل الله مہمانی کند
 یا الہی! گلشنِ اقبالِ سلطانِ تازه دار
 کز شمیمش تیرہ خاکِ ہند ریحانی کند
 گفتہ ام ناظرِ دعاءِ دولتِ سلطانِ دین
 وائے خاقانی! کہ مدحِ شاہِ شروانی کند

چولی دامن

قیام لاہور کے زمانے میں ایک اتحادی جلسہ میں پڑھی گئی، جس کے روح و رواں چند اہل خطہ نوجوان تھے۔ یہ ابتدائی مشق کا نمونہ ہے۔

کہا دامن نے یہ چولی سے کہ بھولی چولی !
 او اب صلح کریں، جنگ تو ہو لی، چولی !
 او گلشن کی کریں سیر کہ آتی ہے بہار
 آنکھ غنچوں نے ہے گزار میں کھولی، چولی
 جاگو، جاگو، مری پیاری ! کہ زمانہ جاگا
 آنکھ خورشید جہاں تاب نے کھولی، چولی
 خس و خاشاک سے تو مجھ کو بچا کر جو چلے
 گل شاداب سے بھر دوں تری جھولی، چولی
 پر پرواز بنایا نہ اگر دامن کو
 اڑ کے جائے گی کہاں، میری ممولی چولی ؟
 دیکھیں امید کا تیار ہو خرمن کب تک
 کھیتی آفت کی تو اب ہم نے ہے بولی، چولی
 لطف جب ہے کہ ترا ورد ہو ”دامن، دامن“
 اور شب و روز میں چپتا رہوں ”چولی، چولی“
 برہمن حمد پڑھے، شیخ بھجن گاتا ہو
 عید کے روز رہیں کھیلتے ہو لی، چولی
 کہیں دامن نے یہ اخلاص کی باتیں جس وقت
 ابک انداز دل آویز سے بولی چولی

اے مرے پیارے پڑوسی، مرے ساجن، دامن!
 تیری باتوں سے گئی دل کی سب الجھن، دامن
 حاصلِ آمید کی کھیتی کے ہیں دونوں ہم تم
 میں جو ہوں خوشہ تو تم آس کے ہو خرمن، دامن
 اک فقط پردہ دیوار تھا حائل ہم میں
 لیکن اٹھی ترے روزن سے نہ چلمن، دامن
 رنج و راحت میں مرا ساتھ اگر تم دو گے
 میں نہ چھوڑوں گی تمہارا کبھی دامن، دامن
 تو کبھی پریم سے پیارے جو مرے گھر آ جائے
 میری آنکھیں ہوں تری دید سے روشن، دامن
 تو جو منہ پھیر کے کھچتا نہ رہے مجھ سے مدام
 میں محبت میں لگا دوں تری تن من، دامن
 یارِ دمساز تو صحرا کو بھی گلشن کر دے
 ورنہ بے یار تو گلشن بھی ہے گلخن، دامن
 دشتِ آفت میں اگر چاک ہو دامانِ مراد
 خارِ صحرا ہو رفو کے لیے سوزن، دامن
 میری طینت میں مخمّر ہے محبت تیری
 کاش پہچانے بھی تو دوست سے دشمن، دامن
 غور سے دیکھو تو دامن کا ہے چولی سے نکھار
 اور چولی کا بھی دامن سے ہے جوہن، دامن
 حق تو یہ ہے کہ مؤذن کی صداء تکبیر
 کیشِ وحدت میں ہے ناقوسِ برہمن، دامن
 آخرش پیار سے دامن نے منا لی چولی
 اور بڑے شوق سے سینے سے لگا لی چولی

آخری یادگار

یہ نظم کمشنر بندوبست، میجر جے۔ ایل۔ کے آنجھانی کے کشمیر سے رخصت ہونے پر ایک گارڈن پارٹی میں پڑھی گئی اور خان بہادر غلام احمد خاں مرحوم، ریونیو منسٹر، کی آخری صحبت کی یادگار ہے۔

ہوا، اے اہل محفل، آج روزِ وصلِ یارِ آخر
آفاق پر چھا گئیں اب ہجر کی شبہاءِ تارِ آخر
نہیں ملتی ہے مہلتِ زندگی میں لطفِ صحبت کی
یونہی مل کر بچھڑ جاتے ہیں یاں یاروں سے یارِ آخر
کوئی دم، ہمدمو! یہ سیرِ دریا کا نظارہ ہے

سب اپنی اپنی راہیں لینگے کشتی کے سوارِ آخر
غم و شادی میں ہجر و وصل کے دن بیت جاتے ہیں
مگر آلفت کی رہ جاتی ہے باقی یادگارِ آخر
چھپاتے تھے تری آلفت کو تیرے چاہنے والے

دمِ رخصت ہوئے سب راز پنہاں آشکارِ آخر
تجھے عالم میں لا کھوں کھیتیاں سیراب کرنی ہیں
مگر برسے گا اس وادی پر، اے ابرِ بہار! آخر
کسی دن کھینچ لائینگے تجھے یاں موسمِ گل میں

نسیم و عیش و گمرگ و نشاط و شالامارِ آخر
نہ ہوگا محوِ خاطر سے تری یہ ڈل کا آئینہ

تجھے یاد آئینگے یہ سرو و شمشاد و چنارِ آخر
ہوا جب بزمِ مشتاقان سے یارِ مہربان رخصت

بنا لی شمعِ محفلِ شوق نے تصویرِ یارِ آخر

محبت کشتِ دل کو مدتوں سیراب رکھتی ہے
یہ وہ گلزار ہے جس کی نہیں ہوتی بہار آخر
یہ منظرِ جاں فضا ناظر ہمیشہ یاد رہتے ہیں
دلوں میں گھر جو بنتے ہیں سدا آباد رہتے ہیں

موتیوں کا ہار

: میرے محترم اور دیرینہ دوست خانصاحب شیخ عبدالعزیز صاحب ،
سابق آنریری سیکریٹری ، انجمن حمایت اسلام ، لاہور ، نے اپنی دختر
نیک اختر کی کتخدانی کی تقریبِ سعید پر مجھ سے فرمائش کی کہ ایک
وداعی نظم ان کی خدمت میں بھیجوں ۔ اسی زمانہ میں اپنی دختر کی
طرف سے بھی ایسی ہی فرمائش ہوئی ۔ لہذا اشعار ذیل میں دونوں
فرمائشوں کی تعمیل کی گئی ۔ نظر ثانی میں کسی قدر ترمیم کی گئی ہے ۔

ہے رخصت آج تری، الوداع ، بنتِ عزیز!
کفیلِ کار ترا لطفِ کردگار رہے
تمہارے دم سے شگفتہ رہی فضا گھر کی
نسیم جیسے چمن میں شگوفہ کار رہے
مثالِ غنچہ گلستان میں جب سے کھولی آنکھ
نثار تم پہ سدا شاخ و برگ و بار رہے
جدائی نورِ نظر کی پدر کی آنکھوں سے
یہ وقت وہ ہے کہ تازیت یادگار رہے
تمہاری یاد سے دل شاد بھی ہے ، غمگین بھی
برنگِ لالہ کہ رنگین و داغدار رہے

یہ حال دیدہ گریاں کا تھا دمِ رخصت
 کہ برشگال میں جس طرح آبشار رہے
 پرانا گھر تھا محبت کا تیری گہوارہ
 نئے وطن میں بھی آفت کا کاروبار رہے
 چمن میں عیش کے فصلِ بہار ہو کہ خزاں
 تمہارے لب پہ سدا خندہ بہار رہے
 دلوں میں مہر و محبت کا گر رہے پیوند
 تو نا گوار بھی انسان کو خوشگوار رہے
 ترانہ ریزِ محبت رہیں در و دیوار
 تو صحنِ خانہِ مسرت کا نغمہ زار رہے
 خیالِ پست نہ آئے کبھی تصور میں
 یہ دل منازلِ علوی کا رہ گزار رہے
 نہ غیظ و غصہ سے برہم ہو اعتدالِ مزاج
 دل و دماغ کا آئینہ بے غبار رہے
 وہ اعتدالِ طبیعت ہو رنج و راحت میں
 کہ سوز و ساز سے بستی کے سازگار رہے
 بشر کو ضبط و تحمل کی گر نہ ہو توفیق
 ہمیشہ عیش کے ماتم میں سوگوار رہے
 جو سرد و گرم جہاں سے کبھی پڑے پالا
 تو دل نہ یاس کی ظلمت سے تنگ و تار رہے
 وہ نازِ نوعِ بشر ہے، وہ فخرِ نسواں ہے
 جو غمزدوں کی مصیبت میں غمگسار رہے

تکلم آس کا ہو غمگین دلوں کو تسکین پاش
 نسیم دشت میں جس طرح مشکبار رہے
 کمینہ پن کا نشان ہے غرورِ دولت و جاہ
 ہے آبرو یہی انسان کی، خاکسار رہے
 کیا سپردِ خدا تجھ کو، فی امان اللہ
 آسی کے لطف کا سر پر ترے حصار رہے
 یہ سلکِ گوہرِ معنی ہے ہدیۂ ناظر
 یہ موتیوں کا گئے میں تمہارے ہار رہے

پنجاب

ایک فوجی دربار میں پڑھی گئی۔

ایا! خاکِ پنجاب مینو سرشت
 تری سر زمین، رشکِ باغِ بہشت
 ترا نام رٹتا ہوں، پیارے وطن!
 میں بلبَل ترا، تو ہے میرا چمن
 ہے گھوارہ تو مردِ میدان کا
 دبستان ہے تو عشق و عرفان کا
 نہاں خاک میں تیری رخشاں گہر
 ترے گنجِ بخش اور گنجِ شکر
 ہیں جنت کی نہریں یہ دریا ترے
 ہیں رشکِ چمن دستِ پہنا ترے

ترے خوان پر دعوتِ کائنات

ترے کشت و خرمن میں سب کی برات

جو مولد ہے اسپانِ تازی کا تو

تو منشا ہے مردانِ غازی کا تو

ہے مشہورِ عالم تری آب و گل

ترا نام ہے کشورِ زندہ دل

تری خاک اکسیرِ نشو و نما

ہوا میں تری جنبشِ ارتقا

ترے نام کی دھاک پنجاب ہے

تری فوج ہر سو ظفرِ یاب ہے

ہے عہدِ شجاعت کی تو داستان

ہے تو جوہرِ تیغِ ہندوستان

اقلیمِ سخن

یہ نظم ۱۸۹۶ء میں شملہ کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ اس عرصہ میں غزل بہت سی ارتقائی منزلیں طے کر چکی ہے اور دورِ حاضر کے اکثر شعرا نے ہامال اور ان نیچرل مضامین ترک کر کے قدرتی مناظر اور نظری جذبات کی مصوری شروع کر دی ہے، جس کو میں اپنے اس خوابِ شملہ کی تعبیر سمجھتا ہوں۔

اے اہلِ بزم، بیٹھے ہو تم کس خار میں؟

اب مے نہیں وہ میکدہ روزگار میں

وہ شمع جس پہ گرتے تھے پروانہ وار تم
 گل ہو چکی ہے محفلِ نا پائیدار میں
 وہ شاعری کہ زینتِ تاج و سریر تھی
 اب ٹھیکرا ہے بھیک کا شہر و دیار میں
 یہ فکرِ ہرزہ کار کی باطل پرستیاں
 بے کیف ہیں مذاقِ حقیقتِ شعار میں
 بزمِ مشاعرہ میں ہیں حضرت غزل سرا
 اور لاشہ زیرِ خاک ہے کنجِ مزار میں
 زلفِ دراز و آہِ رسا کی کفند سے
 چڑھتے ہیں بامِ یار پہ شبہاءِ تار میں
 چاہِ ذقن میں ڈوب کے ہیں غوطہ زن کبھی
 مستِ خرامِ خط کے کبھی سبزہ زار میں
 بد عہد، بد زبان، بد آموز، بد گمان
 شائیں یہ دلبری کی ہیں یاروں کے یار میں
 اقلیمِ شاعری کو کیا شاعروں نے تنگ
 ہیں کوءِ یار میں، کبھی گیسوءِ یار میں
 اہل سخن گرے ہیں مقامِ بلند سے
 جس طرح آبشار گرے کوہسار میں
 ہستی سے ان کی دیدہ دوراں ہے بے نیاز
 جگنو چمک رہے ہیں جو شبہاءِ تار میں
 روزِ ازل سے جن کو متاعِ سخن ملی
 بس نادر الوجود ہیں وہ روزگار میں

ہم تم تو مانگے تانگے کا کرتے ہیں کاروبار
 کیا لطف اس معاملہ مستعار میں
 بدلا مذاقِ دہر نے اندازِ حسن و عشق
 اب دلفریبیاں بھی نئی ہیں نگار میں
 جو جذبہ ہوا دل سے رہی زندہ شاعری
 ہے دفن آج ضلعِ جگت کے مزار میں
 اہل سخن کو، حیف! کچھ آتا نہیں نظر
 دورِ زمان و گردشِ لیل و نہار میں

نغمے بہار کے ہیں کہیں چشمہ سار میں
 تائیں ملار کی ہیں کہیں آبشار میں
 ”گوش آشنا جو تو ہو نواہاءِ راز کا“
 ہر برگ ہم زبان ہو ترا سبزہ زار میں
 فطرت کی شاعری ہے سرودِ نسیمِ صبح
 اور نغمہ مرغِ زار کا ہر مرغزار میں
 صحرا و کوہسار میں ہے بویہ زلفِ دوست
 جلوہ ہے روءِ یار کا ہر لالہ زار میں
 اک شانِ دلربائی ہے نرگس کی آنکھ میں
 اک ساعدِ حنائی ہے شاخِ چنار میں
 کیا کیا عجائباتِ نہاں زیرِ آب ہیں
 اور کائناتِ بحر ہے کس کاروبار میں
 زیرِ فلک ہے بحرِ ہوا میں طلسم کیا
 زیرِ زمیں ہے سنگ میں کیا اور شرار میں

القصہ، چشمِ دل کو اگر کوئی وا کرے
 لاکھوں عجائبات ہیں اس گیر و دار میں
 اے اہل شملہ! اٹھو کہ چلتا ہے کارواں
 اور مستِ خواب تم ہو ابھی رہ گزار میں
 سرکار کاش بھیج دے ان سب کو لام پر
 یہ، عاشقوں کی فوج جو ہے کوءِ یار میں
 ناظر نے آج خوب رقیبوں کی لی خبر
 لائے کشاں کشاں تھے اسے کوءِ یار میں

رام پور

ریاست رام پور کے بعض غیر آباد دیہات کی نو آبادی کے سلسلہ میں چند سال رام پور میں قیام رہا۔ اس کے تاثرات کا نتیجہ یہ نظم ہے۔

مرحبا، خوش آمدی، اے قاصدِ فرخندہ فال!
 تیرے اندازِ پیاس میں ہے اداءِ رام پور
 ہے محبت سے خمیر اس خاکِ دامن گیر کا
 آشنا سے ہے ہوا نا آشنا رام پور
 وہ فضاءِ حسنِ پرور، وہ ہواءِ عشقِ خیز
 وہ نواءِ نغمہ ہاءِ جاں فزاءِ رام پور
 وہ سفیدہ، فجری اور لنگڑا ہیں اٹمارِ بہشت
 جن سے شیریں کام ہے شیریں نواءِ رام پور

کعبہ و بت خانہ یار آکر ہوئے ہمدستاں
 مصطفیٰ آباد نے پہنی رداء رام پور
 مسجدوں سے جب اٹھا شورِ اذان ہنگامِ صبح
 گونج اٹھی اللہ اکبر سے فضاء رام پور
 خاک سے اس کی وہ اٹھے عارفِ روشن ضمیر
 جن سے شرق و غرب میں پہنچی ضیاء رام پور
 درس گاہِ عالیہ ہے اک حصارِ دیں پناہ
 ہے عرب سے تا عجم زلّہ ربّاء رام پور
 وہ حجازی لہجہ میں ترتیلِ قرآنِ کریم
 صوتِ جبریلِ امین میں ہے نواء رام پور
 ہے ترے دامن سے وابستہ تری قومِ غیور
 فکر فرما اس کی، اے فرمانرواء رام پور
 موج زن اس کی رگوں میں ہے وہی خونِ سلف
 منحصر جس کی بقا پر ہے بقاء رام پور
 مصطفیٰ آباد اب تک شعر سے آباد ہے
 ہے شبستانِ شہی میں بھی نواء رام پور

الو کا گیت

سری نگر میں نشیمن ناظر کے قریب تخت سلیمان کی پہاڑی کی کھوہ میں
ایک ہراثمی الو رہتا تھا۔ صبح و شام کی ہوا خوری میں بلا ناغہ آس کی
موسیقی سامعہ نوازی کرتی تھی۔ اس لیے اشعار ذیل میں اس راہب
غارنشین کی ترجمانی کی گئی۔

میں ہوں الو اللہ والا، ہو کے ترانے گاتا ہوں
اللہ ہو کے نعروں سے سوتے پرہت کو جگاتا ہوں
دنیا فانی کے دیوانے، فرزانے کھلاتے ہیں
اللہ اللہ کرنے والا، میں الو کھلاتا ہوں
غاروں کی ظلماتوں میں، سنسان اندھیری راتوں میں
حرص و ہوا کی آگ بجھا کر من کی جوت جگاتا ہوں
شہروں کے ہر فتنہ و شر سے میرا بسیرا آونچا ہے
چھینٹوں سے اس پاپ نگر کے دامن اپنا بچاتا ہوں
خاک کے پتلے کی تعمیریں خاک میں ملنے والی ہیں
اس لیے پرہت کی غاروں میں کٹیا اپنی بناتا ہوں
کل دنیا میں دھاک تھی ہر سو جن کے شان و تجمل کی
آن کے فلک بوس ایوانوں کے آج کھنڈر دکھلاتا ہوں
جام شکستہ دولتِ جم کا مستوں کو دکھلاتا ہوں
کسریٰ اور قیصر کے محل پر نوبت روز بجاتا ہوں
ست جگ کا وہ پریم پیالہ کالجگ سے کافور ہوا
انسان کو انسان کے لہو کا پیاسا اب تو پاتا ہوں

نفس پرستی نوع بشر پر آفت لانے والی ہے
 انسان کو پاداشِ عمل کا میں پیغام سناتا ہوں
 شاہ و گدا کے کان میں ہر دم دورِ قلع یہ کہتا ہے
 مزدوروں کے در ہر گردنِ مغفوروں کی جھکاتا ہوں
 لوبھی، پاپی، پیٹ کے بندے میری نوائیں کیا سمجھیں
 ناظر ہے اس راگ کا رسیا، اس کو گیت سناتا ہوں

موت کا راگ

یہ نظم ایک عجیب و غریب خواب کی یادگار ہے۔ علی گڑھ کالج میں
 میں اور سید آل احمد ایک بنگلہ میں رہتے تھے۔ پچھلی رات کے وقت میں
 نے خواب دیکھا کہ کچھ فاصلہ سے ایک نہایت پر سوز اور درد ناک لہجہ
 میں گانے کی آواز آ رہی ہے۔ اسی حالتِ خواب میں میں اس آواز کے
 پیچھے روانہ ہوا۔ کچھ فاصلہ پر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گاؤں میں
 آگ لگ رہی ہے۔ چھتوں اور دروازوں سے شعلے اٹھ رہے ہیں اور
 ایک دروازے پر ایک مطرب سارنگی ہاتھ میں لیے ایک درد انگیز دھیمی
 لے میں پنجابی گیت گا رہا ہے۔ میں نے پوچھا، ”یہ کون سا گاؤں ہے
 اور تم کیا گا رہے ہو؟“ اس نے جواب دیا، ”یہ تمہارا گاؤں ہے اور میں
 موت کا راگ گا رہا ہوں“۔ یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر میری آنکھ
 کھل گئی۔

اسی وقت ساتھ کے کمرے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے
 دروازہ کھولا، سید آل احمد کو آواز دی اور رونے کا سبب پوچھا۔
 انہوں نے فرمایا، ”میرے بڑے بھائی سید ابو محمد جو حصولِ تعلیم کے
 لیے ولایت جا رہے ہیں آج کل بمبئی میں ہیں۔ میں ابھی یہ ہیبت ناک

خواب دیکھ رہا تھا کہ شہر بمبئی کے ایک بازار میں ایک ماتمی جلوس جا رہا ہے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا، 'یہ کس کا جنازہ ہے؟' اس نے جواب دیا، 'ایک امرو ہے کے نوجوان سید کا'۔ یہ جواب سن کر میری چیخ نکل گئی اور میں خواب کی حالت میں رو رہا تھا کہ تمہاری آواز سے بیدار ہوا۔

اس واقعہ کے بعد میری نیند جاتی رہی۔ ذیل کے اشعار اس بے خوابی کا نتیجہ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سید ابو محمد کا بمبئی میں انتقال ہو گیا اور ہمارے گاؤں 'ہریہ والہ' تحصیل و ضلع کجرات میں نوے اشخاص طاعون کا شکار ہو گئے۔

دوش چشم چوز نظارۂ عالم آسود
واہمہ عرصہ آفاق بخوابم بنمود
گاہ بر طرف چمن سیر و تماشا می کرد
گاہ در دامن کہسار منازل پیمود
ناگہاں نغمہ جاں سوز بگوشم برسید
کانچنان مطرب ایام بہ گیتی نہ سرود
ساعتے در پے آن نغمہ دویدم بر سو
تا رسیدم بسرِ قریہ پر از آتش و دود
شعلہ پیچیدہ بہر بام و در و سقف و ستون
اندر آن قریہ تو گفتی کہ زد آتشِ نمرود
مطربِ سوختہ سامان سیر کو دیدم
کہ در آن آتش سوزندہ ہمی گفت سرود
گفتم، ای نالہ دلدوز چہ داری در سر؟
وہی ہمہ شعلہ جاں سوز چسان روئے نمود

دل کی کلی کھلا گئی موجِ نسیمِ صبح*
 شاید یہ آ رہی تھی دیارِ حبیب سے
 ناظر کو کشمیر سے جانے نہ دیجیو
 رونق ہے اس چمن کی اسی عندلیب سے

حسنِ شہرِ آشوب کا عالم میں جلوا ہوا
 عشق نے جب آنکھ کھولی اس سے پردا ہو گیا
 آرزؤں کا چمن پر خار صحرا ہو گیا
 اے مرے اللہ! یہ دل کو مرے کیا ہو گیا
 یاس میں جب اس کی مڑگاں کا اشارہ ہو گیا
 ڈوبتے دل کو یہ تنکے کا سہارا ہو گیا
 میری نظروں میں جہاں قاریک سارا ہو گیا
 جب نہاں آنکھوں سے وہ آنکھوں کا تارا ہو گیا
 ہے اسی کا غلِ طوبیٰ اور اسی کا باغِ خلد
 قامت و رخ کا ترے جس کو نظارا ہو گیا
 پرتوِ رخ سے اسی کے ہے یہ سب نور و ظہور
 چاند کوئی بن گیا، کوئی ستارا ہو گیا
 دل کے بدلے مل گیا، جاناں! غمِ آفت ہمیں
 یہ بہارا ہو گیا اور وہ تمہارا ہو گیا

* ایک خط کی طرف اشارہ ہے جو میرے فرزند عزیز حبیب اللہ خان
 کی صحت یابی سے متعلق تھا۔

گفت من مطربِ آن بزمِ حریفان بودم
 کہ نمودند ز مے خانہ ہستی پدرود
 شعلہ زارے کہ تو دیدی شررِ برقِ فناست
 نوحہ غم کہ شنیدی ز دل سوختہ دود
 روزِ دیگر خبر آمد ز عزیزانِ وطن
 کہ بہ بستند نود کس ز جہاں رختِ وجود
 رازِ رویاء خود از فلسفہ دانے جسم
 گفت، این عقدہ بہ انگشتِ تفکر نکشود

عید ”رومان“

یہ نظم ۱۹۳۶ء میں بہ تقریبِ تہنیتِ عیدِ الفطر رسالہ ”رومان“
 لاہور میں شائع ہوئی۔

ہو مبارک محفل ”رومان“ کو یاروں کی عید
 آسمانِ عشق کے رخشندہ سیاروں کی عید
 اک جہاں ہو آفاق اور اک خیالی ہو ہلال
 جس سے حسن و عشق کے ہواں پرستاروں کی عید
 ناظرِ صحرا نشیں، خلوت گزین کی عید کیا
 عید ہے یاروں کی، میخواروں کی، گزاروں کی عید
 آئیے پیرانہ سر عیدِ جوانان دیکھیے
 یہ بھی کوئی عید ہے بلغم کے بیماروں کی عید
 دیکھیے شہروں میں چل کر عید کی وہ لہر بہر
 حسنِ یوسفؑ سے ہے کوچوں اور بازاروں کی عید

ان میں حسن و عشق کے سرمست منظر دیکھیے
 ہر طرف ہے دلبروں کی عید ، دلداروں کی عید
 وہ بہارِ نوجوانی ، وہ طرحداروں کی عید
 وہ غاموں کی زر افشانی ، وہ دستاروں کی عید
 میکدہ میں عشق کے ہے آج میخواروں کی عید
 اور چشمِ مست کے مدہوش نظاروں کی عید
 عید کے دن بتکدے کی سیر بھی کر لیجیے
 دیکھیے واں حسن کے ہر سمت اوتاروں کی عید
 پھر بہانے عید کے آس شوخ سے مل لیجیے
 جس کے رخ کی دید ہے آفت کے بیماروں کی عید
 عید گہ میں پھر حضورِ قلب سے پڑھیے نماز
 روزہ داروں کی بھی ہے اور دینداروں کی عید
 قافیہ کی رو میں ناظرِ تم بھی کیا بہتے گئے
 عیدِ اصلی ہے یہی حق کے پرستاروں کی عید
 اک طرف سوز و گداز اور اک طرف ہے عیش و ناز
 بے زروں کی عید وہ ہے ، یہ ہے زرداروں کی عید
 یاس سے لبریز دل ہیں ، جیبِ درہم سے تھی
 یہ ہے بیکاروں ، نراسوں اور ناداروں کی عید
 انجمن میں بھیجیے چندہ یتیموں کے لیے
 تاکہ ہو اسلامیوں کے ان جگر پاروں کی عید
 دشت میں ناظرِ خضر سے عید ملنا چاہیے
 بے نظر سے جن کی ان خاموش نظاروں کی عید

پیغام شاعر

شعر ہر رنگ میں ہے مطربِ فطرت کی نوا
 شاعری کے لیے پابندی، پیغام نہیں
 جذبہ، دل کا مصور ہے خیالِ شاعر
 کفر و اسلام کے جھگڑوں سے اسے کام نہیں
 ملک و ملت سے محبت نہیں اس کی محدود
 خادمِ کعبہ ہے اور ہادمِ اصنام نہیں
 دلِ شاعر کی ہے ہر آن میں اک شانِ نئی
 ایک حالت میں کبھی وہ سحر و شام نہیں
 گاہ وہ جوشِ عمل سے ہے تڑپتا پیہم
 یاس سے گاہ ابھرتا دلِ ناکام نہیں
 مبحثِ منعم و مزدور و ملوک و جمہور
 فرقہ بندی کے ہیں پیغام، یہ الہام نہیں
 حرب و ہیکار کی دیتا ہے زمانہِ تعلیم
 فتنہ و شر کے سوا جس کا کچھ انجام نہیں
 شارعِ عام پہ چلتے ہیں لکیروں کے فقیر
 جادۂ اہل نظر رہ گزرِ عام نہیں
 پختہ کا رانِ سخن کا ہے تخیلِ آزاد
 فکرِ پیغام بیجز واہمہ، خام نہیں
 موجِ دریا کی طرح رقص ہے دل کا، ناظر
 بس میں کچھ آپ کے یہ جنبش و آرام نہیں

الکشن

اب حکومت نے نظام ملک بہتر کر دیا
 کوئی ممبر کر دیا، کوئی منسٹر کر دیا
 دیسیوں کو بھی کمشنر اور کلکٹر کر دیا
 ایک کوسی . آئی . ای . اور ایک کوسر کر دیا
 جلوہ گر ہیں کونسلوں میں ملک کے قائم مقام
 ان سے ایوان حکومت کو منور کر دیا
 اے الکشن، زندہ باش ! اے ممبری، پائندہ باش !
 سب بلند و پست کو تو نے برابر کر دیا
 جن غریبوں کو امیروں کا نہ ہوتا تھا سلام
 اب انہیں تایا ، چچا ، ماموں ، برادر کر دیا
 ساگ سبزی تھی ہمیشہ جن غریبوں کی غذا
 آج الکشن نے انہیں مستِ مزعفر کر دیا
 گرچہ کونسل میں رہے ممبر ہمارے دم بخود
 ووٹ کی نوبت جو آئی ہاتھ اوپر کر دیا
 کہہ رہے تھے آپ لیکن ”دائرے“ میں گاؤں کے
 لاث صاحب کو مرے ”لچکر“ نے ششدر کر دیا
 روپیہ میں مالیہ کے اب چونی رہ گئی
 مرتبہ ہم نے زمینداری کا برتر کر دیا
 یہ تو سب سچ ہے مگر اس ممبری کے عشق نے
 گاؤں کے پنچوں میں ہر مہتر کو کہتر کر دیا

مہری سے ملک کو کچھ نفع یا نقصان ہو
 سب زمینداروں کا ڈھیلا اس نے پنجر کر دیا
 گو اضافہ کر دیا اس نے مصارف میں بہت
 پر بت سوراج کا آباد مندر کر دیا
 آہ! میدانِ الکشن! اس تری گھڑ دوڑ نے
 اسپ تازی کو لکد کوپ دوسد خر کر دیا
 ہی کر اک جام الکشن ووٹروں نے کہہ دیا
 ہم تو دیں گے ووٹ اس کو جس نے لب تر کر دیا
 پیٹ پوجا کو الکشن کے پجاری آ گئے
 اور پرانے پاپیوں کو بھی پوٹر کر دیا
 اک طرف سردار خاں تھا، اک طرف جبار خاں
 ان کے لشکر نے بیا میدانِ محشر کر دیا
 ہر طرف سڑکوں سے اٹھے وہ بگولے گرد کے
 ووٹروں اور موٹروں کو خاک ہر سر کر دیا
 سر سے لے کر پاؤں تک خاکی ہوا سارا لباس
 منہ پہ مٹی اور کیچڑ کا پلستر کر دیا
 بھائی بھائی، باپ بیٹے میں لڑائی ٹھن گئی
 اور میدانِ جنگ کا ہر گاؤں، ہر گھر کر دیا
 دونوں سرداروں کے لشکر جب صف آرا ہو گئے
 اس کو دارا کر دیا، اس کو سکندر کر دیا
 گاؤں میں دونوں یہ عزت دار تھے، سردار تھے
 آج لچھمن شاہ کا دونوں کو چاکر کر دیا

دونوں یہ خوش پوش اب ننگے دھڑنگے رہ گئے
 جیب بے زر کر دیا اور خانہ بے در کر دیا
 اس تگاہو میں یہ دونوں ہار تھک کر رہ گئے
 مہری کے خوف نے گھوڑوں کو خچر کر دیا
 بائے، اے ظالم الکشن ! کس نئی ترکیب سے
 ساری موٹی مرغیوں کو تو نے بے ہر کر دیا
 اب الکشن آفیسر پر ہو رہے ہیں اعتراض
 اس نے کچھ ووٹوں کو گڈ مڈ، نیچے اوپر کر دیا :
 آمد آمد اب نئے ٹیکسوں کی ہے، سرکار نے
 مہروں کی فوج کا بہتہ مقرر کر دیا

غزلیات

یہ غزل مفرح القلوب کی پیداوار ہے اور آغازِ بہار کے نزلہ و بخار کی یادگار۔
 حسنِ گل گرچہ بہ ہنگامِ بہار اچھا ہے
 اس سے بلبل کا مگر نالہ زار اچھا ہے
 لالہ و گل کا گلستاں میں نکھار اچھا ہے
 سارے اچھوں میں مگر روءِ نگار اچھا ہے
 مہر و مہ اچھے ہیں، رخشنده ستارے اچھے
 چشمِ بینا میں مگر جلوۂ یار اچھا ہے
 تندرستوں کو مبارک ہو شگوفے کا جال
 دلِ پژمرده کو یہ کاسۂ تار اچھا ہے

المدد، یادِ محبان! کہہ ہو!ا دل ے کل
 جو مصیبت میں خبر لے وہی یار اچھا ہے
 گرچہ جنت ہو، بری ہے پہ غریب الوطنی
 جو جنم بھوم ہو اپنا وہ دیار اچھا ہے
 خاکِ کشمیر ہے گل ریز، پر اے پیارے وطن!
 تیری گلیوں کا ہمیں گرد و غبار اچھا ہے
 رس بھرا آم ہارا، وہ بہشتی میوہ
 سیب و رماں سے ترا ذائقہ دار اچھا ہے
 اپنے پپل کے وہ پتوں کا ترنم دلکش
 تیرے کھڑاک سے، اے شاخِ چنار! اچھا ہے
 حاصلِ عمر جوانی تھی، سو دیوانی تھی
 زندگی کے تو دریا کا آثار اچھا ہے
 بے حیا، شوخ، فسوں ساز، ستم گر، بد عہد
 پانچوں عیب اس میں ہیں، یہ یاروں کا یار اچھا ہے
 اپنی ٹانگوں کے ہی بل پر ہے مزا چلنے کا
 گرچہ کہتے ہیں کہ پیدل سے سوار اچھا ہے
 ہم صفیروں سے تصور میں ملایا اس نے
 تندرستی سے تو ناظر کا بخار اچھا ہے
 کہہ رہے تھے سرِ رہ دلی کے روڑے، ناظر
 شعر کے فن سے تو واقف یہ گنوار اچھا ہے

مطرب "مفرح" کی فرمائش پر رسمی رنگ میں لکھی گئی۔

جو محفل میں وہ شمع رو بن کے نکلا
 تو سینے سے دل آرزو بن کے نکلا
 کل اس رخ کے جب رو برو بن کے نکلا
 تو گلشن سے وہ زرد رو بن کے نکلا
 تجلی کی تیری ہے یاں تاب کس کو
 بگڑ جائیں گے سب جو تو بن کے نکلا
 بھری آہ جنگل میں وحشی نے تیرے
 تو شعلہ سا اک چار سو بن کے نکلا
 کبھی جوشِ سودا بہا اشک ہو کر
 رگِ جاں سے گاہے لہو بن کے نکلا
 گھلا شمع کی طرح جو عمر ساری
 وہ اس بزم سے سرخرو بن کے نکلا
 جو کل ساقی بزمِ عیش و طرب تھا
 وہی آج جامِ سبزو بن کے نکلا
 وہ گل پیر بن آگیا جب چمن میں
 تو گل اس کے لینے کو بو بن کے نکلا
 یہ کیا دست و صحرا میں دوں لگ رہی ہے
 مگر بن میں وہ شعلہ رو بن کے نکلا
 چمن کی خرابی پہ بلبل کا نالہ
 درِ باغ سے آبِ جو بن کے نکلا
 صنم خانہ میں غل جو "ہرنام" کا تھا
 وہی کعبہ سے "اللہ ہو" بن کے نکلا

کھستان پہ ناظر جو ابرِ کرم تھا
گستان سے وہ رنگ و بو بن کے نکلا

کہتا ہے شوق جلد ملیں گے حبیب سے
کہتی ہے یاس ملتے ہیں بچھڑے نصیب سے
سن لی ہے وقتِ رفتہ کی حالی سے داستان
کیا فصلِ گل کا حال سنیں عندلیب سے
ٹوٹے کو اور توڑنا، پھوٹے کو پھوڑنا
قدرت کے کاروبار بھی ہیں کچھ عجیب سے
سو جھی ہے کوئی حضرتِ واعظ کو دور کی
ہم کو ڈرا رہے ہیں عذابِ قریب سے
اے دل! نسیمِ باغ سے دل کی تپش بیجا
آتے ہیں یہ بہار کے جھونکے نصیب سے
بیمار سے بھی غیر ہے حالتِ طبیب کی
کیا ہو امیدِ چارہ نوازی طبیب سے
طے ہوں گے کب یہ منزلِ جاناں کے راستے
آتے نظر تھے دور سے تو کچھ قریب سے
ناظر! زمینِ شعر کا کیجے نہ بندوبست
کھیتوں کو جا کے ناپیٹے، حضرت! جریب سے
عاشق کا ایک نعرہ مستانہ کر گیا
جو کام ہو سکا نہ ادیب و خطیب سے
ایوانِ مملکت میں یہ کل ہوں گے صدرِ بزم
جو آج خاکِ رہ میں ہیں بیٹھے غریب سے

خالی تھی بزمِ عیش مے لالہ فام سے
 عشق آ کے اک نگاہ میں سر مست کر گیا
 منزل بہارِ عمر کی یوں ہو گئی تمام
 آنکھوں سے جیسے خواب کا نقشہ گزر گیا
 اس منزلِ فنا سے ہوا اپنا یوں سفر
 مہمان سرا سے جیسے مسافر گزر گیا
 ہوجھیں گے اس سے منزلِ مقصود کا نشان
 گر کاروان کے ساتھ کوئی باخبر گیا
 اے عندلیبِ نغمہ سرا تو ہی کچھ بتا
 وہ کاروانِ لالہ و گل اب کدھر گیا
 یہ عشق تھا کہ کوئی بگولا تھا دشت کا
 جو مشتِ خاک کو مری برباد کر گیا
 خاکِ چمن میں پھولِ مسرت کے مل گئے
 کانٹا جو غم کا تھا وہی دل میں آتر گیا
 کشتی اب اپنی عمر کی ساحل پہ آ لگی
 طوفانِ زندگی مرے سر سے گزر گیا
 ناظرِ زمانہ آ گیا آخر خار کا
 اب مستیِ شباب کا نشہ آتر گیا

دہلی کے آخری تاجدار حضرت ظفر کی غزل پر لکھی گئی۔

”یار تھا، گزار تھا، بادِ صبا تھی، میں نہ تھا“

ہائے! بزمِ ناز میں خلقِ خدا تھی، میں نہ تھا

آبِ چشم و دانہ اشک اپنی ہے کل کائنات
مدتوں اس آب و دانہ پر گزارا ہو گیا
تھی بلندی میں تو یاروں کی بہت ہمت بلند
حوصلہ ہست آ کے ہستی میں بہارا ہو گیا
منزلِ مقصود سے کیا بحث، ناظر! چل دے
جس طرف کو اس کی چٹون کا اشارا ہو گیا

اس غزل کے بعض اشعار میرے طبعی رنگ کے خلاف ہیں۔ احباب
”مفرح“ اور میر مغنی کی فرمائش سے لکھی گئی۔

لو دیتے ہیں مفت میں، بتو! لو دل لو، جاں لو، جو چاہو سو لو
ہم آنکھ کا پا گئے اشارہ منہ سے تم بولو یا نہ بولو
اس گل سے برابری کا دعویٰ پھولو! شبنم سے منہ تو دھو لو
دنیا کھیتی ہے آخرت کی گل کاٹنا ہو تو آج بو لو
تر دامنی ہے دلیلِ رحمت دامنِ مے ناب میں ڈبو لو
ہے صبح کو کوچ کارواں کا کوئی دم میٹھی نیند سو لو
جس راہ سے قافلہ گیا ہے اے راہرو! اسی پہ ہڑ لو
ناصر! مری عشق کی خطائیں میزان میں عقل کی نہ تولو
بے درد کی زندگی ہے بے کیف اک نشترِ غم ذرا چھو لو
کہتی ہے نسیم صبح کاہی اے سبزہ خفتہ! آنکھ کھولو
آتے ہیں مشاعرے میں ناظر حضرت کے قدم، سخنورو! لو

ساقیا بے مرے و مینا ہی وہ مخمور رہا
تیری مستانہ نگاہوں سے جو مسحور رہا

دل لیے پھرتے تھے گو کوچہ و بازار میں ہم
 دلربا دیدہ مشتاق سے مستور رہا
 کوہ و صحرا میں جسے ڈھونڈتا پھرتا تھا کلیم*
 اس کے دل ہی میں نہاں وہ شرِ طور رہا
 جسمِ خاکی کو دیا حق نے ضمیرِ روشن
 اس دئے ہی سے یہ ظلمت کدہ پُر نور رہا
 قربِ جانان میں پڑے جان کے لالے، افسوس!
 میرے نزدیک وہی اچھا ہے جو دور رہا
 کوئی مختار تو پیدا نہ ہوا زیرِ فاک
 جو رہا عالمِ اسباب میں مجبور رہا
 مستِ زندانِ خرابات رہیں گے، جب تک
 باغ میں شاخِ رز و خوشہٗ انگور رہا
 رند و زاہد میں کوئی فرق نہ دیکھا ہم نے
 اس کو سوداء بتاں، اس کو غمِ حور رہا
 فلسفی حجت و برہان میں ہوا کاملِ فن
 گرچہ خود دل کی تسلی سے بہت دور رہا
 واعظ! اب روضہٗ رضوان کا بھی کچھ حال سناؤ
 وعظ میں نارِ جہنم کا ہی مذکور رہا
 نغمہٗ عشق میں وہ وجد، وہ حالت نہ رہی
 گرچہ مطرب کا وہی تار، وہ طنبور رہا
 دیکھ کر کوچہٗ دلدار میں سرمایہٗ حسن
 مدتوں ناظرِ دل باختہ مزدور رہا

اس غزل کا تغزل سے کوئی علاقہ نہیں۔ حیاتِ ثانیہ کے شاعرانہ خواب کی تعبیر ہے۔

کیا اپنا حال، یا رب! انجامِ کار ہوگا
 جب زندگی کا بیڑا دریا سے پار ہوگا؟
 اس نوشِ جاوداں میں کیا نیشِ غم نہ ہوگا
 گلشن میں خندہ گل بے بیمِ خار ہوگا؟
 دلکش فضا میں ہوں گی، ٹھنڈی ہوائیں ہوں گی
 یا آندھیوں کا واں بھی گرد و غبار ہوگا؟
 فردوس میں رہے گا نورِ معر ہمیشہ
 یا واں بھی اختلافِ لیل و نہار ہوگا؟
 ہوں گے یہی ستارے سر پر وہاں ہمارے
 اور اپنی قسمتوں کا ان پر مدار ہوگا؟
 بزمِ خیال کا یہ نقشہ جا رہے گا
 نقاشِ فکر واں بھی مصروفِ کار ہوگا؟
 نوعِ بشر میں باہم واں آشتی رہے گی
 یا یہ مصافِ ہستی اور کارِ زار ہوگا؟
 خلدِ بریں میں ہوگا پست و بلند یکساں
 یا ناتواں قوی کا واں بھی شکار ہوگا؟
 الفت کا غم نہ ہوگا، فکرِ شکم نہ ہوگا
 جنت میں تیری، واعظ! کیا کار و بار ہوگا؟
 طاعت کی مزد لے کر کیا زاہدِ ریائی
 جنت کی نعمتوں کا سرمایہ دار ہوگا؟

عشقِ بتاں میں، واعظ! کی جس نے حق پرستی
 اس بندہٴ خدا کو جنت میں بار ہوگا؟
 جنت کی حور ہوگی مرمر کی مورتی سی
 یا عشوہ و ادا بھی مصروفِ کار ہوگا؟
 واعظ! تجھے بتا دوں رازِ نہفتہ لیکن
 باتوں کا میری تجھ کو کیا اعتبار ہوگا؟
 ہے یہ تری زباں پر جو جنت اور جہنم
 یہ قہرِ یار ہوگا، وہ لطفِ یار ہوگا
 : عمرِ رواں کی کشتی جب جا لگی کنارے
 اک بحرِ بیکراں میں اس کا گزار ہوگا؟
 یہ شمعِ زندگانی، یہ نورِ غیرفانی
 آئندہ محفلوں میں پھر جلوہ بار ہوگا
 جس پھول کو خزاں نے ہے خاک میں ملایا
 گلشنِ کا فصلِ گل میں پھر تاجدار ہوگا
 نیساں کا ایک قطرہ جو گم ہوا صدف میں
 پھر اس سے نقشِ ہستی گوہرِ نگار ہوگا
 جو آبِ جو چمن سے دریا میں جا گرا ہے
 دریا سے پھر ابھر کر ابیر بہار ہوگا
 ہے روحِ زندگانی اک سیرِ جاودانی
 پنہاں جو آج ہوگا، کل آشکار ہوگا
 اس وصل کی گھڑی کا، ناظر! میں منتظر ہوں
 جب چشمِ شوق ہوگی اور روءِ یار ہوگا

جس رہگزر سے میرا ناقہ سوار نکلے
 یا رب! اسی میں میری جانِ نزار نکلے
 دیکھیں تو کس کا قامت ہے فتنہٴ قیامت
 گلشن سے سرو نکلے، محفل سے یار نکلے
 کل میکدے میں جا کر آنکھیں کھلیں بہاری
 سمجھے تھے مست جن کو سب ہوشیار نکلے
 تقدیر کی ہے اپنی تدبیر سے لڑائی
 دیکھیں توجیت کس کی اور کس کی ہار نکلے
 تھی شیخ جی سے ہم کو ناحق کی بدگانی
 وہ تو بڑے رنگیلے، یاروں کے یار نکلے
 آئینہٴ سکندر، ایوان و قصرِ قیصر
 دنیاۓ دُور کے جلوے ناپائدار نکلے
 گرداب کے وہ چکر، موجوں کے وہ تھپیڑے
 ہم بحرِ زندگی سے مر مر کے پار نکلے
 ان منظروں کے ناظر چھٹنے کا غم نہ کرنا
 اس گلشنِ جہاں سے لاکھوں ہزار نکلے

یہ طرحی غزل رام پور کے ایک شاندار شاعر نے منعقدہ ۳۱
 دسمبر ۱۹۲۶ء میں پڑھی گئی۔ مصرع طرح متصوفانہ رنگ کا تھا۔ اس
 لیے ان سے معرفت کے متوالوں کی محفل میں ہم بھی لہو لگا کے شہیدوں
 میں مل گئے۔

کیا قیس کی آنکھوں میں حیرت کا تماشا ہے
 جو محفل ہے صحرا کا، اک محفلِ لیلیٰ ہے

ہر سنگ میں اس در کے اک طور کا جلوہ ہے
 جب فرش پہ سر رکھا بس عرش کا نقشا ہے
 ہر ذرہ رقصاں میں خورشید کا پرتو ہے
 ہر سینہ سوزاں میں اک جلوہ سینا ہے
 میں محو خطا کوشی، تو وقفِ عطا پاشی
 میں غرقِ معاصی ہوں، تو عفو کا دریا ہے
 جو ہاتھ نہیں آتی، وہ نعمتِ عقبیٰ ہے
 جو ساتھ نہیں جاتی، وہ دولتِ دنیا ہے
 اب نغمہ روحانی دل کو نہیں تڑپاتا
 وہ شورِ ہوسناکی، وہ حرص کا غوغا ہے
 وہ روح کا کاشانہ، ہے نفس کا بت خانہ
 مسجد میں شوالا ہے، کعبہ میں کلیسا ہے
 اب عشق کے متوالے کس میکدے کو جائیں
 ساقی ہے نہ وہ ساغر، مے ہے نہ وہ مینا ہے
 عالم کے یہ نظارے عبرت کے دبستان ہیں
 کر میر جہاں، ناظر! گر دیدہ یینا ہے

با پیرِ مغاں روزے در دیرِ مغاں رقت
 دیدم بہ رخِ ساقی وز جان و جہاں رقت
 از جورِ زمان پیشش چوں نالہ کنان رقت
 بخشید بمن جامے، از سود و زیاں رقت
 آن مطربِ خوش الحان مستانہ نوا سر کرد
 ہر دل چو سکونم رنخت از شور و مغاں رقت

دلبر چو بہ دل جا کرد، از نطق و بیاں رقم
 چوں عشق یقین آموخت از وہم و گمان رقم
 خورشید رخس روزے پرتو بدلم انداخت
 چوں قطرہ شبنم من ناگہ ز میان رقم
 در باغِ مصلّا زد یک رو سیہی خیمہ
 بر خوابگہ حافظ من مرثیہ خوان رقم
 بر خاکِ شہیدانت، اے مملکتِ اسلام!
 با دیدہ خونِ بزم، چوں سیلِ رواں رقم

یہ غزل حضرت خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید کی خواہش سے لکھی گئی۔

اک طرفہ معاً ہے وہ شاہد ہر جائی
 وہ خود ہی تماشا ہے اور خود ہی تماشا
 اس گیسوء مشکین کا سودا ہے ہر اک سر میں
 اس ساعدِ سیمیں کی ہر دل پہ ہے گیرائی
 جب سے دل دیوانہ ہے یار کا کشانہ
 ہے محفلِ جانانہ یہ گوشہ تنہائی
 یہ خم کدہ ہستی، مدہوشوں کی ہے بستی
 اک جامِ معلق ہے یہ گنبدِ مینائی
 ہے بزمِ حریفان میں مستی کا وہی عالم
 شیشہ ہے نہ پیمانہ، صہبا ہے نہ صہبائی
 دل خانہ ویران تھا، اک قالبِ بے جاں تھا
 پھر جان میں جاں آئی، کی کس نے مسیحائی؟

قاتل! ترے کوچے میں ہم خود تو نہیں آئے
 تم کو تو ادا لائی اور ہم کو قضا لائی
 دل تنگ ہوں میں، یا رب! اس تنگی صحرائے
 اک دشتِ جنوں کر دے عالم کی یہ پہنائی
 ویرانہ وحشت میں ہے قیس سے یارانہ
 دیوانے کا دیوانہ، شیدا کا ہوں شیدائی
 بستی کی کشاکش میں اک چیز ہی کام آئی
 بازو کی توانائی یا دل کی شکیبائی
 کل جس کے ترانوں کی اک دھوم تھی گلشن میں
 اب گوشہ صحرائے اور ناظرِ صحرائی :

یہی جو آس رخِ تاباں کی آب و تاب رہے
 تو کس کی آنکھ کو جلوے کی آس کے تاب رہے
 نگاہِ لطف رہے مجھ پہ یا عتاب رہے
 ترے حضور میں یہ بندہ باریاب رہے
 نصاب میں جو رخِ یار کی کتاب رہے
 تو امتحان میں عاشق ہی کامیاب رہے
 بلا سے بنک میں اپنا نہ کچھ حساب رہے
 بس ایک کنجِ چمن اور اک کتاب رہے
 تمہارے دیکھنے والوں نے تم کو دیکھ لیا
 رہے حجاب میں بھی تم تو بے حجاب رہے
 کوئی سمجھ نہ سکا وہ رموزِ راز و نیاز
 ہمارے نامہ و پیغام لاجواب رہے

نگاہِ مست تری، ساقیا! مرا غمِ عشق
یہ میکہدہ رہے باقی یہی شراب رہے
کہ عدو کا ہو مجھ کو نہ اپنی قسمت کا
تری نگاہِ کرم ہر جب انتخاب رہے
مرے گناہوں کا، یا رب! جو حشر میں ہوشیار
تو بخششوں کا بھی تیری کوئی حساب رہے
بشر جو دل سے نکالے ہواءِ نام و نمود
تو پھر نہ یہ غمِ دنیا کا اضطراب رہے
گجر سحر کا بچا اور زمانہ جاگ اٹھا
تھے میرے قافلے والے کہ مستِ خواب رہے
بنی جو نجد میں کونسل تو قیس نے یہ کہا
کہ عاشقوں کا جدا گانہ انتخاب رہے
جو بزمِ شوق میں ناظرِ کبھی ہو نغمہ سرا
تو شیخ و شاب کو اک نشہ شراب رہے

ہمارے میرِ مغنی نے ایک صحبت میں کسی استاد کی ایک غزل نہایت
پر سوز انداز میں گائی، جس کا مطلع یہ تھا :

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا
جھونکا ہوا کا جیسے ادھر سے ادھر گیا

بزمِ حریفان کی فرمائش سے اسی رنگ میں ذیل کی غزل لکھی گئی .

دل میں خیالِ یار ہے جب سے گزر گیا
آجڑے ہوئے دیار کو آباد کر گیا

صبحدم صحرا میں جو پھیلا گئی بوہ چمن
 وہ شمیم گیسوہ نکھت فزا تھی، میں نہ تھا
 کاروانِ خفتہ کی جس سے ہوئیں نیندیں آچاٹ
 اک تھکے بارے مسافر کی صدا تھی، میں نہ تھا
 جس کے کیفِ نغمہ سے بزمِ چمن سرمست تھی
 شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا تھی، میں نہ تھا
 جو سوارِ موج دم بھر قلمِ ہستی میں تھی
 وہ حبابِ آسا کوئی شکلِ فنا تھی، میں نہ تھا
 منزلِ ہستی کے پیچ و خم میں جب میں گم ہوا
 اک اشارتِ غیب کی واں رہنا تھی، میں نہ تھا
 لکھ دیا کاتب نے جب لوحِ جبین پر فردِ جرم
 اس کا مجرم، گرچہ سب میری خطا تھی، میں نہ تھا
 جس نے اک عالم میں رازِ عشق رسوا کر دیا
 حسنِ بے پروا کی وہ بھی اک ادا تھی، میں نہ تھا
 کعبہ سے ناظر جو جا نکلا کبھی بت خانہ میں
 یہ بھی شوقِ دید کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

یار کی بزمِ ناز میں	جو نہ کشیں جوانیاں
وہ بھی کسی حساب میں	آئیں گی زندگیاں
تازہ جہاں میں ہے ابھی	قصہٴ قیسِ عامری
اور جم و کیقباد کی	بھول گئی کہانیاں
بھول گئی جفاءِ دوست	وہ بھی تھی اک اداءِ دوست
یاد رہی وفاءِ دوست	یار کی مہربانیاں

سرو و سمن بہار میں کس کے ہیں انتظار میں
 کس کے خرامِ ناز کی باغ میں ہیں نشانیاں
 ناز و نیاز میں ہوا روزِ ازل معاملہ
 عشق کی جاں فروشیاں حسن کی دل ستائیاں
 حسن کی وہ اداء ناز کچھ نہ سمجھ سکے کلیم
 دعوتِ شوق دید تھیں طور کی لن ترانیاں
 لغتِ جگر کباب ہے خونِ جگر شراب ہے
 آج خیالِ یار کی دل میں ہیں مہانیاں
 کہہ دیا چشمِ شوق نے یار سے دل کا ماجرا
 کامِ زباں کا دے گئیں عشق میں بے زبانیاں
 پیرِ مغاب نے بزم میں نغمہٗ شوق سر کیا
 وجد میں آئیں پیریاں رقص میں تھیں جوانیاں
 ناظرِ خوش نوا مگر بزمِ چمن میں آگئے
 بھول گئی ہیں بلبلیں باغ میں نغمہ خوانیاں

کس کو وہ طرزِ ستم بھاتا نہیں کس کو اس ظالم پہ پیار آتا نہیں
 اس نگاہِ فتنہ سامان کی طرح تیرو پیکانِ دل کو ہر ماتا نہیں
 شادمانی جا کے پھر آتی نہیں غم جب آتا ہے تو پھر جاتا نہیں
 گاشنِ عالم میں نخلِ دوستی پھلِ وفاداری کا اب لاتا نہیں
 ہے عمل کا شور و غوغا ہر طرف با عمل کوئی نظر آتا نہیں
 لفظ و معنی میں ہم آہنگی نہیں دل زباں کو رازداں پاتا نہیں
 شہر کا واعظ جوانِ جنگ جو صلح کا اب وعظ فرماتا نہیں

مطربِ ایام بزمِ دہر میں وہ سرودِ سرمدی گاتا نہیں
 اب خیالِ زلفِ عنبرِ بارِ دوست عشق کی محفل کو گرماتا نہیں
 جو نہیں دار و رسن سے کھیلتا سر بلندی عشق میں پاتا نہیں
 یہ کھلونے ہیں خدائے عشق کے تو بتوں سے دل کو بہلاتا نہیں
 دل تو ہے ناظرِ ہوسناکی سے پاک
 آنکھ کا لپکا مگر جاتا نہیں

یہ غزل بلاسپور تحصیل، ریاست رام پور، کے ایک مشاعرے میں بعض
 نوجوان اور رنگین طبع احباب کے اصرار سے فکاہی رنگ میں لکھی گئی۔
 پہلا مصرع مصرعِ طرح تھا :

غنیمت، ہمدو! سمجھو یہ صحبت عیش والوں سے
 ہے اک دن عیش کا بہتر مہینوں اور سالوں سے
 غمِ دلدار سے کیا بوالہوس اغیار کو نسبت
 غزالانِ ختن کو کیا علاقہ ان شغالوں سے
 تمہارے عارض و گیسو میں باہم سازگاری ہے
 محبت ہو گئی کیسی یہ ان گوروں کو کالوں سے
 زلیخا کی طرح، ان سب کو بھیجو جیل خانے میں
 کہ بن پڑتا نہیں کچھ کام ان یوسف جالوں سے
 کھلا ہے دفترِ عرفاں فضاءِ کوہ و صحرا میں
 حدیثِ عشق لکھ دی دشت میں مجنوں نے چھالوں سے
 نہ نکلا کام، ساقی! جامِ جم سے محفلِ جم میں
 جو تیرے خاکساروں نے لیا مٹی کے پیالوں سے

کریں گی رجز خوانی اب عنادل صحنِ گلشن میں
 فغاں سے کچھ ہوا حاصل، نہ نکلا کام نالوں سے
 نشاطِ زندگی، اے دوستو! تم کو مبارک ہو
 مگر چلئے گا بیچ کر قحبہ دنیا کی چالوں سے
 جہاں میں دھاک تھی جن کے سلف کی تیغ براں کی
 سڑک پر آن کو کنکر کھودتے دیکھا کدالوں سے
 ہوئے قاراج تخت و تاج ذوقِ عشق بازی میں
 خدا سمجھے بتانِ بے وفا پر مرنے والوں سے
 ہے ناظر یہ غزل خوانی تری بے کیف و بے معنی
 نہ صحبت بے کمالوں سے، نہ آفتِ باجالوں سے

رباعیات

یہ طائر عقل و فہم پر بستہ رہا
 اسرارِ نہاں کا اس پہ در بستہ رہا
 گو عقل نے وا کئے ہزاروں عقدے
 سر بستہ جو راز تھا وہ سر بستہ رہا

زاہد میں وہ شانِ حق پرستی نہ رہی
 وہ رند میں عاشقی، وہ مستی نہ رہی
 ویرانہ نیا کوئی بسائیں، ناظر
 قابل رہنے کے اب یہ بستی نہ رہی

انسان کا قدم اگر پھسل جاتا ہے
 لغزش سے وہ جھینپتا ہے ، پچھتا رہا ہے
 شیطانِ لعین مگر خطائیں اپنی
 دنیا میں اچھالتا ہے ، پھیلاتا ہے

آرام و سکون کا وہ زمانہ نہ رہا
 وہ عیش و نشاط کا ترانہ نہ رہا
 مریخ کو چل کر ناظرِ آباد کریں
 دنیا کے کہن میں آب و دانہ نہ رہا

پیری میں کوئی اب سر و سودا نہ رہا
 وہ ذوقِ نظر، شوقِ تماشا نہ رہا
 اب حضرتِ ناظر اس چمن سے چل دو
 گزارِ جہاں کا وہ نظارا نہ رہا

وہ شعر و غزل کا اب زمانہ نہ رہا
 وہ مطربِ عشق کا ترانہ نہ رہا
 بدلی ہے فضاءِ دشت و صحرا ، ہمدرد
 وہ نجد میں قیس کا فسانہ نہ رہا

لذات سے زندگی کی سرور رہو
 کیفِ بستی سے مست و مخمور رہو

ذوقِ راحت کی معصیت سے لیکن
مزدور کی طرح، منعمو! دور رہو

انسان کا نہ شکوہ سنج انسان ہوتا
محتاج غنی سے یوں نہ نالاں ہوتا
گرتی نہ زمیں پہ آسماں سے بجلی
یاں، کاش! بلند و پست یکساں ہوتا

ہے گرچہ برائی سے بھلائی اچھی
اور جھوٹ سے بالیقین سچائی اچھی
سچ سے یہ لے گیا ہے بازی اکثر
اب جھوٹ میں آگئی صفائی اچھی

مستوں میں نہیں وہ عشق و مستی باقی
وہ پیرِ مغان ہے اور نہ ساقی باقی
مے خانہ میں مے حافظ و رومی کی نہیں
باقی ہے برانڈی اور و سکی باقی

ناظر! یہیں تم بھی آ بیٹھو اور بن میں دھوئی رہا بیٹھو
شہروں میں گرو پھر جیلوں کو کوئی ناچ نچانے والے ہیں

”جوگی“ خوشی محمد ناظر کا شاہکار اور اردو کی مشہور ترین
نظموں میں سے ہے۔ عرصہ تک اس کا انتخاب درسی کتابوں میں
شامل رہا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (جٹان، ۲۸ جون ۱۹۷۱ء)
کی رائے میں

”قبول عام کی سند حاصل کرنے میں حالی کا
مستند، اقبال کا شکوہ اور ناظر کا جوگی
کم و بیش برابر تھے۔“

ناظر نے زیادہ تر نظمیں لکھیں، تاہم انہیں دوسری اصناف
پر بھی دسترس تھی۔ ان میں غزل، رباعی، مثنوی، مرثیہ اور
سہرہ شامل ہیں۔ ان کے مجموعہ ”کلام کا یہ دوسرا انڈیشن
ہے۔“